www.urducouncil.nic.in

جولائی 2020 ، قیمت :- ₹10

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصلویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

بچوں کی دنیا

جلد:8 شمارہ:07 جولائی 2020

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم :اجمل سعید

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000
شعبہ ادارت:11-49539009
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ/100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی-110066
فون:26109746
ای میل:sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ	05
مضامین		
کورونا وائرس اور بچے	اشرف آثاری	06
حیرت انگیز کیڑے، پتنگے اور پودے	ایچ ایم یٰسین	09
کوے کے بارے میں بھی کچھ جانیں	شمیم اقبال خاں	13
ڈاکٹر سالم علی: ماہر پرند	عبدالشاہد	18
آن لائن مطالعہ و تعلیم		
ڈیجیٹل لائبریری	منور حسن کمال	22
آن لائن تعلیم و تدریس	منظر امن	24
نظمیں		
آنولہ	عبدالرزاق دل	27
چلو چل کے رتنا گری گھوم آئیں	عبدالرحیم نشتر	28
دعوتِ امن	عبدالمتین جامی	29
ہمارا اسکول	حارث انصاری برہان پوری	30
سائنس گھر ہے جانا	امان الحق بالاپوری	47
بارش آئی بارش آئی	عاتکہ ماہین	47
کہانیاں		
سفر ٹوتھ برش کا	منظور پروانہ	31
مہربان چاچا	ملک بزمی	33
محبت کا نرالا انداز	سلیم خان	38
فرشتہ صفت	محمد قیوم میو	41
خوب کھلائی کھیر	سعدیہ پروین	45
بچوں کا کتب خانہ		
فلکیاتی نظارے	نایاب حسن	48
اردو کا جادو		
اردو زبان کا جادو	ادارہ	50
قسط وار ناول		
اُدتیہ سمندری لڑکا	انیتا سرن، مترجم: نامی انصاری	51
کہکشاں		
دل کی باتیں		58
ننھے فنکار		
خدمت	ادیبہ عفت	60
بچوں کی پینٹنگ		61

آپس کی باتیں

عزیز بچو! آج آپ سب سے بہت چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے کا من کر رہا ہے۔ وہ چھوٹی باتیں جن پر دھیان نہ دینے کی وجہ سے ہمارے بڑے سپنے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہماری آرزوئیں اور خواہشیں دم توڑ دیتی ہیں اور منزلیں ہم سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ دیکھیے صحت بڑی نعمت ہے، یہ بات بظاہر چھوٹی سی ہے مگر اسی سے ہماری ساری زندگی جڑی ہوئی ہے۔ ہم صحت کا خیال نہیں رکھتے ہیں تو بیمار پڑ جاتے ہیں، جسم کمزور ہو جاتا ہے اور اسپتال تک جانے کی نوبت آجاتی ہے اور وہاں بھی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ پیسے نہ ہوں تو مشکل اور بڑھ جاتی ہے۔ پیارے بچو اسی لیے اپنی صحت کا خیال رکھیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ''جان ہے تو جہان ہے'' آپ اپنے جسم و جان کی جتنی حفاظت کریں اتنا ہی اچھا ہے اسی لیے ہم نے یہ سوچا ہے کہ آئندہ بچوں کی صحت سے متعلق ایک کالم شروع کریں گے جس میں بچوں کی بیماریوں کے بارے میں بتاتے رہیں گے۔

اسی طرح 'وقت کی قدر کرو' چھوٹی سی بات لگتی ہے مگر اس پر دھیان نہ دینے کی وجہ سے وقت ہمیں ناقدری کی سزا دیتا ہے اس لیے جو بھی وقت ملے اس کا صحیح استعمال کریں، اسے ضائع نہ ہونے دیں، اپنے وقت کو کتابوں سے رشتہ جوڑنے میں صرف کریں اور ایسے کام کریں جن سے معاشرے کو فائدہ ہو۔ جن لوگوں نے وقت کی قدر نہیں کی وہ ہمیشہ پچھتاتے رہتے ہیں اور انھیں وہ منزل بھی نہیں مل پاتی جس کی انھیں طلب ہوتی ہے۔

یہی معاملہ والدین کے احترام کا بھی ہے، کیونکہ جب آپ بہت چھوٹے ہوتے ہیں تو والدین ہی آپ کی پرورش کرتے ہیں، آپ کی ذرا سی تکلیف پر وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ آپ ان کے ایک دن کی پرورش کا بدلہ بھی نہیں چکا سکتے۔ خاص طور پر ماں جو ہمیشہ آپ کا خیال رکھتی ہے، آپ کہیں باہر رہتے ہیں تو دروازے پر ماں کی آنکھیں لگی رہتی ہیں۔ جب تک آپ آنہیں جاتے تب تک وہ پریشان حال رہتی ہے۔ اس لیے بچو! اپنی ماں کا خیال رکھو خاص طور پر جب وہ بوڑھی ہو جائیں تو ان کا اسی طرح سہارا بنو جس طرح بچپن میں وہ تمھارا سہارا تھیں کیونکہ ماں ایک ایسی نعمت ہے جسے تم دولت سے نہیں خرید سکتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں، کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جاتے ہیں، ان کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی ماں کو یا تو تنہا چھوڑ دیتے ہیں یا پھر اولڈ ایج ہوم میں چھوڑ آتے ہیں۔ یہ حرکت بہت ہی غلط ہے۔ جب کہ بیٹا چاہے جتنا بڑا ہو جائے وہ ماں کی نظر میں بچہ ہی رہتا ہے۔ کچھ لوگ ماں کے سارے احسانات کو بھول جاتے ہیں اور اپنی عیش و عشرت کی خاطر انھیں تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک صاحب نے ایسی ہی حرکت کی تھی کہ اپنی ماں کو اولڈ ایج ہوم میں چھوڑ دیا۔ ایک دن وہ اولڈ ایج ہوم سے واپس آرہا تھا کہ ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا کیا تمھاری ماں تمھارے پاس رہتی ہے؟ دوسرا دوست جو بہت ہی شریف اور نیک تھا اس نے کہا کہ میں ابھی اس قابل نہیں ہوا ہوں کہ ماں کو اپنے پاس رکھ سکوں۔ میں ابھی بھی اپنی ماں کے پاس رہتا ہوں۔ تو پیارے بچو! ماں جس طرح آپ سے ایک جذباتی رشتہ رکھتی ہے اسی طرح کا رشتہ ماں سے اس کی زندگی کی آخری سانس تک قائم رکھیے تبھی آپ اچھے اور نیک انسان کہلائیں گے۔

آپ کا

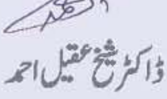

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

ماہ اپریل 2020 کا 10 روپے قیمت رکھنے والا ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' منظر عام پر آچکا ہے جس کو قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (این سی پی یو ایل) نئی دہلی نے شائع کیا ہے، جس کے مدیر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اور مدیر منتظم اجمل سعید ہیں۔ ماہنامہ کے مستقل کالم اس طرح ہیں: مدیر کا خط، بڑوں کی باتیں، مضامین، نظمیں، کہانیاں، باتصویر کہانی، قسط وار ناول، کہکشاں اور ننھے فنکار۔ مدیر جناب ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے 'مدیر کا خط' میں لکھا ہے کہ اردو ہمارے ملک کی میٹھی اور محبت کی زبان ہے۔ اس کے ذریعے ہم تہذیب وسلیقہ سیکھ سکتے ہیں۔ بھائی چارے اور محبت کو فروغ دے سکتے ہیں'' ڈاک خانہ میں ماہ جنوری اور فروری کے شماروں پر قارئین نے خط لکھ کر رائے دی ہے۔ مضمون 'تتلی' میں برہما کے تتلیوں کو شاپ دینے کی بات کہی ہے۔ یہ لفظ 'شاپ' ہے یا 'شراپ' ہے پتہ نہیں۔ ہم نے تو شراپ ہی سنا ہے، لیکن مضمون پڑھنے لائق ہے۔ ڈاکٹر بانو سرتاج صاحبہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ جناب مقبول احمد سراج صاحب بنگلور نے 'بھارت کا عظیم طوطا گھر' کے عنوان سے طوطا گھر کا تعارف کروایا ہے۔ جناب غفار قادر نے ایفل ٹاور کا بچوں سے تعارف کرایا ہے۔ 'نیند ایک عظیم نعمت' کے عنوان سے امتیاز احمد انصاری آسنسول (مغربی بنگال) نے دو صفحات کا کافی معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے۔ اور نیشنل سلیپ فاؤنڈیشن کی تحقیق کو پیش کرتے ہوئے نوزائیدہ سے لے کر بڑی عمر کے افراد تک، کون کتنے گھنٹے نیند کرے، اس کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے۔ اس سے ہٹ کر بھی وہ نسخہ جات بتائے ہیں جس سے نیند اچھی آسکے۔ تسنیم فیضی نے گوالیار سے 'ہمالیہ کی کہانی خود اس کی زبانی' لکھا ہے۔ کافی ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے اس کہانی میں ہمالیہ بچوں سے ہم کلام ہے۔ وہ کہتا ہے ''میں دکن مشرق سے نکل کر ہندوستان کے شمال میں تلوار کی طرح پھیلا ہوا ہوں'' جناب علیم صبا نویدی دکن کے معروف شاعر وادیب ہیں انھوں نے 'گھڑی' پر نظم لکھی ہے۔ جب کہ محمد اسداللہ نے 'پیڑ نہ کٹنے پائیں' نظم تحریر کی ہے جو کافی دلچسپ ہے اور بچوں کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ خرم عماد گلبرگہ نے 'بہادر لڑکے' نامی کہانی پیش کی ہے، کہانی خوب ہے۔ گلبرگہ اردو ادب کا دبستان ہے لیکن یہاں بچوں کے لئے لکھنے والوں کی کمی ہے۔ ہوسکتا ہے خرم عماد اس کمی کو پورا کریں۔ محمد منیر رحمانی، خوشنودہ نیلوفر، متین الدین، شریف الحق، ریحان کوثر، وغیرہ کی کہانیاں بھی شمارے میں شامل ہیں۔ باتصویر کہانی 'انسانیت' کی چوتھی قسط بھی بھرپور اور مزے دار ہے، جس کے مصنف انیس اعظمی ہیں۔ آدتیہ سمندری لڑکا۔ نامی ناول کی چوتھی قسط شامل ہے۔ کہکشاں نامی کالم میں 'دانائی کی باتیں' عنوان سے شیکسپیئر، ابراہم لنکن، اور برنارڈ شا کے اقوال کو جگہ دی گئی ہے۔ لکھا ہے: مضبوط ارادے ماں بناتی ہے (شیکسپیئر) ہر وقت کام میں منہمک رہو کہ کامیابی کا سارا راز اس میں پوشیدہ ہے (ابراہم لنکن) جب تک اچھا اب تخلیق ہوتا رہے گا اور معصوم بچے مسکراتے رہیں گے تو انسانیت کا مستقبل تاریک نہیں ہوسکتا۔ (برنارڈ شا) چمن چمن کے پھول، عنوان سے 'بچے' عنوان پر پروین شاکر، ندا فاضلی، خمار بارہ بنکوی، وسیم بریلوی، منور رانا اور قمر سنبھلی وغیرہ کے اشعار جمع کیے گئے ہیں۔ آخر میں 'ننھے فنکار' عنوان کے تحت طلبہ کی مصوری کو جگہ دی گئی ہے۔ جس میں مدھیہ پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر، اعظم گڑھ، کیرلہ اور جموں وکشمیر، کے طلبہ کی مصوری کو شامل کیا گیا ہے۔

محمد یوسف رحیم بیدری، مہاراشٹر

اشرف آثاری

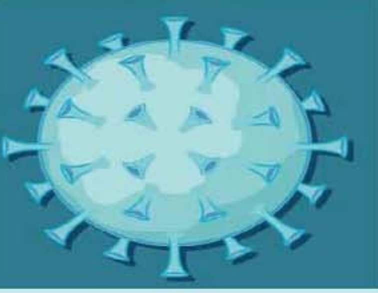

کورونا وائرس (Coronavirus) اور بچے

بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں اور یہ جس قدر صحت مند، پڑھے لکھے، با اخلاق اور بیدار مغز ہوں گے، اسی قدر پہلے نوجوانوں کی اور بعد میں بزرگوں کی ایک مثالی پود تیار ہوگی جن سے مستقبل میں ایک بے مثال ملک وقوم کی تعمیر ممکن ہوسکے گی۔ والدین چاہے کسی بھی حال میں ہوں اپنی اولاد کو خوش وخرم اور ہنستا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ غریب والدین کا کردار اس سلسلے میں اور بھی قابلِ تحسین وستائش ہوتا ہے کہ وہ محنت ومشقت سے نہ صرف اپنی اولاد کی اچھی پرورش کے لیے دن رات ایک کرتے ہیں بلکہ اپنی وسعت واستطاعت سے بھی آگے جاتے ہیں۔

والدین کی اولین کوشش اور توجہ اپنے بچوں کی صحت اور جسمانی اور ذہنی پرورش پر رہتی ہے۔ اس معاملے میں وہ کسی بھی تساہلی اور لاپروائی سے بہت احتیاط برتتے ہیں۔ بچوں کی صحت کے معاملے میں وہ بہت حساس ہوتے ہیں۔ بچے ویسے بھی، اپنی کم عمری اور جسمانی اور نفسیاتی ساخت کے اعتبار سے بہت نازک اور حساس ہوتے ہیں، اس لیے قدم قدم پر ان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

آج کل کورونا وائرس (Coronavirus) کی وبا کی وجہ سے دنیا بھر میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی ہے۔ دنیا کی پوری آبادی خوف وانتشار میں مبتلا ہوچکی ہے، خاص طور پر ان ممالک میں، جن میں اس وبا نے تباہی پھیلا دی ہے۔ والدین بھی اپنے بچوں کی وجہ سے بہت زیادہ متفکر نظر آتے ہیں۔ اس وبا کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے تعلیمی اداروں میں چھٹی کا اعلان کیا گیا ہے تاکہ بچے اپنے اپنے گھروں میں مقیم رہیں۔ اس وبا سے محفوظ رہنے کے طور طریقوں سے واقف کرایا جارہا ہے اور صحت وصفائی کی طرف خاص خیال رکھا جارہا ہے اور

متعلقہ حکومتیں پوری طرح سے متحرک و مستعد دکھائی دے رہی ہیں۔ طرح طرح کے ضروری اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں اور ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔

چین کے ووہان شہر سے اس وائرس کی ابتدا ہوئی اور اب تک یہ ہندوستان و پاکستان اور امریکہ و برطانیہ کے ساتھ ساتھ دنیا کے سو سے زیادہ ممالک میں پھیل چکا ہے اور تا ایں دم تحریر اس سے ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بن چکے ہیں اور اس تعداد میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ متاثرین کی تعداد لاکھوں میں ہے اور اس میں تشویش ناک حد تک ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔

بچوں میں کورونا وائرس کے متعلق چند اہم باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ عام طور پر بچے بڑوں کے مقابلے میں بڑی آسانی کے ساتھ، کسی بھی انفکشن یا وائرس کا شکار ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی متاثر کر سکتے ہیں یعنی خود بھی کسی وائرس کا شکار ہو سکتے ہیں اور دوسروں میں بھی اسے منتقل کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر وبائی امراض میں بچوں کی ہلاکت کا احتمال زیادہ رہتا ہے لیکن کورونا وائرس کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ ابھی تک بچے، بڑوں کے مقابلے میں محفوظ نظر آ رہے ہیں۔ چین میں ہی ایک نوزائیدہ بچے میں پیدائش کے تیس گھنٹے کے بعد کورونا وائرس کی تشخیص ہوئی ہے۔ اِس وقت تک یہ دیگر سو سے زیادہ متاثر ممالک میں سب سے کم عمر کا، اس وبا سے متاثر بچہ ہے۔ سبھی متاثرہ ممالک میں اس وائرس سے متاثر بچوں کی تعداد بہت کم ہے۔ شعبۂ طب سے متعلق ایک امریکی جریدے میں اس وبائی بیماری کے متعلق ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ جس میں چین کے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے شہر ووہان کے ہسپتالوں میں اس وبا میں مبتلا مریضوں پر تحقیق سے یہ بات بتائی گئی ہے کہ بچوں میں اس وبا کی تشخیص بہت کم ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سلسلے میں مختلف قیاس آرائیاں بھی منظرِ عام پر آئی ہیں لیکن اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں آیا ہے کہ آخر بچوں میں کورونا وائرس کے مریض بہت کم کیوں ہیں؟

یونیورسٹی آف ریڈنگ کے پروفیسر این جونزے، جو مختلف اقسام کے وائرس سے متعلق شعبے سے منسلک ہیں، نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ بچے یا تو کورونا وائرس کے انفکشن سے مکمل طور پر بچ جاتے ہیں یا پھر زیادہ متاثر نہیں ہوتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بچوں کو معمولی نوعیت کا

مرض لاحق ہو جاتا ہے۔جس کی وجہ سے انھیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی نوبت تک بھی کبھی کبھی نہیں آتی، کیونکہ ان میں کورونا وائرس بیماری کی وہ نشانیاں یا علامات واضح طور پر نمودار نہیں ہوتیں، اس لیے اس طرح کے مریض جب ہسپتال تک نہیں پہنچتے تو ان کا اندراج بھی نہیں ہوتا۔

اس بات سے یونیورسٹی آف لندن کی پروفیسر میتھال میکڈموٹ بھی متفق نظر آتی ہیں۔ ان کے خیال میں پانچ سال سے زیادہ اور بیس سال سے کم عمر کے بچوں میں ایسے وائرس کے خلاف قوتِ مدافعت زیادہ ہوتی ہے۔ان کے مطابق اس کے باوجود بھی بچے متاثر ہو سکتے ہیں لیکن یہ ممکن ہے کہ ان میں مرض کی شدت نہ ہو یا اس کی نشانی تک بھی واضح نہ ہو سکے۔

2003 میں چین میں ہی جب سارس وائرس نے تباہی مچائی تھی اور آٹھ ہزار افراد میں اس وائرس کی تشخیص ہوئی تھی اور دس فیصد یعنی آٹھ سو کے قریب مریض زندگی گنوا بیٹھے تھے تو اس وقت بھی سارس وائرس سے مرنے والے بچوں کی تعداد بہت کم تھی۔

2007 میں امریکہ میں عوامی صحت سے متعلق ایجنسی کے ماہرین نے ایسے 135 کیسز کا پتہ چلایا تھا، لیکن ان کے مطابق ان میں کسی بھی بچے کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ کچھ محققین کا یہ بھی خیال ہے، جن میں میک ڈرموٹ پیش پیش ہیں کہ بچے اس وبا سے اس لیے بھی محفوظ رہے، کیونکہ جس وقت جنوری میں کورونا وائرس پھیلا، اس وقت بچوں کی چھٹیاں چل رہی تھیں اور اسکول وغیرہ بند تھے۔اسی لیے بچے محفوظ رہے، پھر اس وائرس کے پھیلتے ہی چھٹیاں فروری اور اب مارچ تک بھی بڑھانے کا فیصلہ لیا گیا۔ویسے بھی جس گھر کے کسی فرد میں یہ وائرس منتقل ہو جاتا ہے، اس گھر کے بزرگ ،بچوں کو فوراً کسی دوسری جگہ، جو نسبتاً محفوظ ہو، منتقل کر لیتے ہیں اور تمام تر بچاؤ تدابیر کو عمل میں لایا جاتا ہے۔

طبی ماہرین کا خیال ہے کہ کچھ ہی بچوں میں اس وائرس کی تصدیق کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جانا چاہیے کہ بچے اس سے متاثر نہیں ہو سکتے کہ والدین بچوں کی خبر گیری سے تغافل برت لیں اور متعلقہ حکام بھی بچوں سے زیادہ بڑوں یا بالغوں کی طرف زیادہ توجہ مرکوز کر لیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی اور لندن امپیریئل کالج سے وابستہ کرسٹل ڈونلی کا کہنا ہے کہ ہانگ کانگ میں جو سارس وائرس پھیلا تھا۔اگر اس کی مثال لی جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ بیماری بچوں کو اتنی شدت سے متاثر نہیں کر رہی ہے جتنی بالغوں کو کر رہی ہے۔

کورونا وائرس اور بچوں کے متعلق یہ چند حقائق تھے جو دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے طبی ماہرین کے تجربے میں آچکے ہیں۔ اس لیے انھیں محض عام لوگوں کی دلچسپی اور جانکاری کے لیے دیا گیا ہے۔اس ضمن میں کسی بھی مزید جانکاری، معلومات یا آگاہی کے لیے اپنے اپنے علاقوں کے متعلقہ سرکاری اداروں اور مقرر کردہ ماہرینِ طب یا معالجین اطفال سے رابطہ کیا جاسکتا ہے تاکہ فوری اور بروقت امداد کے لیے رجوع ہو سکے۔اس ضمن میں کسی طرح کی کوئی بھی لاپروائی یا تغافل کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں ہے۔ ■

Ashraf Asari
Sidrah Bal, Hazrat Bal
Srinagar - 190006 (J&K)

ایچ ایم یٰسین

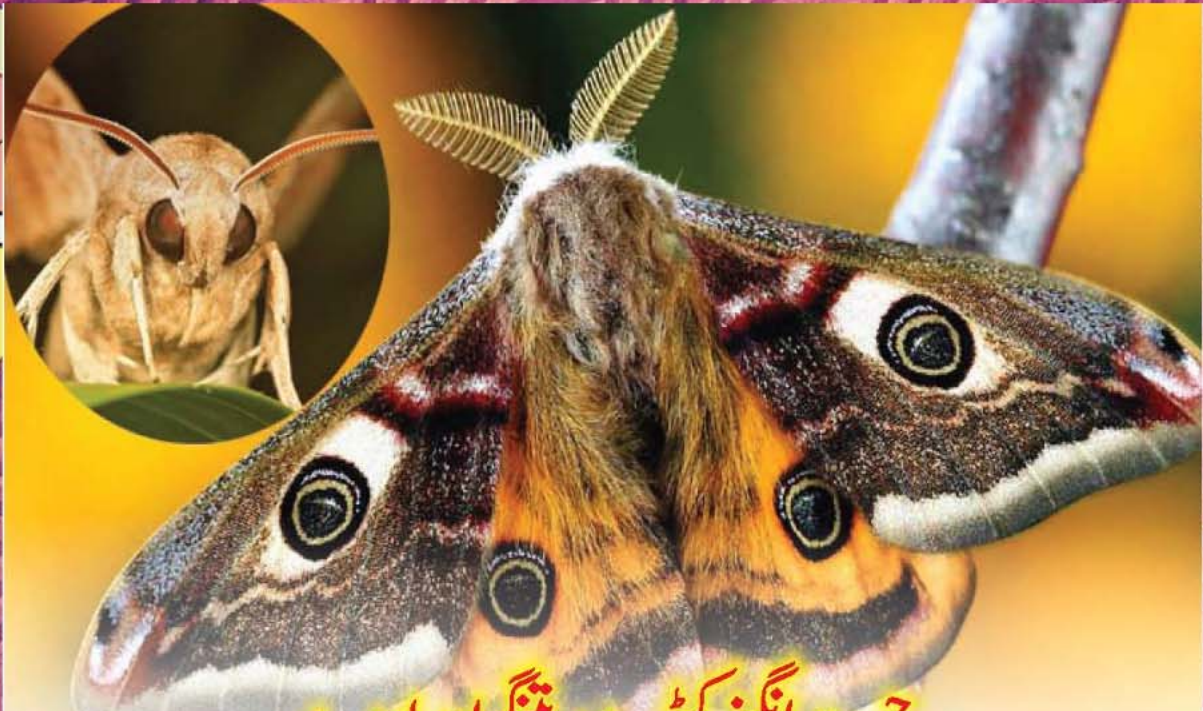

حیرت انگیز کیڑے، پتنگے اور پودے

بچو! آپ جانتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو شکار کا شوق ہوتا ہے۔ وہ چرند و پرند، سمندری حشرات (خاص طور پر مچھلیاں) کا خوب شکار کرتے ہیں۔ اللہ نے چرند و پرند کو بھی اتنی عقل دی ہے کہ ان شکاریوں سے وہ بچ سکیں لیکن کبھی کبھی اپنی غفلت یا دوڑتے دوڑتے تھکنے کی وجہ سے شکار ہونے سے نہیں بچ پاتے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ان میں سے کچھ چھوٹے کیڑے مکوڑے خود کو شکاریوں سے بچانے کے لیے طرح طرح کے روپ دھار لیتے ہیں۔ کبھی ایک سنڈی (کیٹر پلر) خود کو کھینچ کر سانپ کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو کبھی کوئی کیڑا خشک تنکے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ ایک پتنگا (موتھ) جس کا نام ’یوروپیا میٹی کیولوڈینا‘ (Europea Metti Quolodina) ہے وہ کسی بھی مصیبت کے وقت مردہ بے جان پتے کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور دیکھنے والے کی نظر اس کو زندہ پتنگے کے بجائے ’سوکھا پتہ‘ ہی سمجھتی ہے، وہ خطرہ کے وقت دشمن کا نوالہ بننے کے بجائے رُک کر بیٹھ جاتا ہے اور شکاری اس کو محض ایک مردہ بے حس پتہ جان کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

’یوروپیا میٹی کیولوڈینا‘ دو طرح کے ہوتے ہیں، جو بارانی (بہت زیادہ بارش سے متاثر) جنگلات کی زمین میں عام طور پر پائے جاتے ہیں اور جب وہ پتہ بنتا ہے تو اس خمیدہ (مڑے ہوئے) پتے کو دیکھ کر ہر کوئی حیران رہ جاتا ہے۔ اس کی ایک قسم اور بھی ہے جس کے ’پَر‘ روپ دھارنے سے پہلے سپاٹ ہوتے ہیں لیکن پتے جیسا بنتے ہی اس کی رنگت بھی بدل جاتی ہے اور اس پر شکنیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

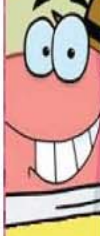

شکیل ایک شرارتی بچہ تھا جو دن بھر گھومتا رہتا۔ نہ پڑھنے میں دھیان لگاتا نہ کسی اور کام میں۔ البتہ اسکول پابندی سے جاتا تھا اور چوں کہ ذہین تھا، اس لیے صرف اسکول میں پڑھائے ہوئے سبق یاد کر لیتا اور امتحان میں ہر سال پاس ہو جاتا۔ اس کا ایک دوست نہال بھی اسی کی طرح کا ایک لڑکا تھا۔ نہال نے ایک تیر کمان بنائی ہوئی تھی اور شکیل کے گلے میں ایک غلیل فارغ وقت میں لٹکی نظر آتی۔ اس کے علاوہ بھی اس نے ایک بڑی سی ڈنڈی میں آگے کی طرف ایک نوکدار کیل لگائی ہوئی تھی۔ کبھی وہ غلیل سے چڑیوں کو نشانہ بناتا تو کبھی اس نوکدار ڈنڈی سے جانوروں سے چھپا کر چبھاتا اور خوش ہوتا۔ اپنے نشانے کی صحیح پرکھ کے لیے وہ کبھی کبھی چھوٹے کیڑوں اور کیچوؤں کو بھی نشانہ بنانے کی کوشش کرتا۔ اس کی نظر بہت تیز تھی اس لیے اکثر کامیاب ہو جاتا اور بہت خوش ہوتا۔

شکیل ایک دن جنگل میں شکار کی تلاش میں ٹہل رہا تھا۔ وہ غلیل کا نشانہ لگا چکا تھا کہ واپسی کے وقت ایک جگہ اس کو وہ پتنگا (موتھ) جس کا نام 'یوروپیا میٹھی کیولی ڈینا ہے' نظر آیا۔ عجیب صورت کا کیڑا دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ اس کو اپنا نشانہ بنانے کے لیے نوک دار ڈنڈی کو چھپا کر اس کی جانب چلا، لیکن 'یوروپیا میٹی کیولوڈینا' نے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا حربہ استعمال کرتے ہوئے خود کو مردہ بے جان پتے کی شکل میں تبدیل کر لیا۔ شکیل اس کی جانب دو چار قدم شکار کرنے کے لیے بڑھا۔ اس کا شکار غائب ہو چکا تھا۔ شکیل کو وہاں سوائے سوکھے پتوں کے اور کچھ نظر ہی نہ آیا۔ وہ حیران ہوا، اس کی نظر گو بہت تیز تھی لیکن یہاں کام نہ آئی، اس نے اس کیڑے کو بہت تلاش کیا، نظریں دوڑائیں۔ وہاں موجود ایک ایک شے پر غور کیا لیکن اسے اس کا شکار نہ ملنا تھا نہ ملا۔ وہ اپنی شکل تبدیل کر کے پتہ بن چکا تھا اور وہیں موجود تھا۔ لیکن وہ اب کر کیا سکتا تھا۔ مجبوراً واپس پلٹا۔ راستے میں نہال ملا جو کسی بزرگ نما شخص کے ساتھ تھا۔ نہال نے شکیل کو ان سے ملوایا اور کہا: جناب ہم دونوں ہی ان جانوروں اور پرندوں اور کیڑوں کا شکر کرتے ہیں۔

بزرگ نے ان دونوں کو نصیحت کی کہ آپ کا یہ عمل گناہ ہے۔ بے چارے جانوروں پرندوں کو بلا ضرورت تفریح کا سامان بنا کر اذیت دینا اللہ کو قطعی پسند نہیں، آپ لوگ اس عمل سے توبہ کریں اور ان ہتھیاروں کو غلیل تیر کمان اور یہ نوکیلی ڈنڈی سب پھینک دیں اور توبہ کریں کہ آئندہ ایسا شکار ہرگز نہیں کریں گے۔

ان دونوں کی سمجھ میں بزرگ کی بات آ گئی۔ انھوں نے توبہ کر لی اور آئندہ گناہ کرنے سے بچ گئے۔

اچھے بچوں کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کا کہنا مانتے ہیں۔

پرندوں کے آنسو پینے والا پتنگا (موتھ)

پیاس ہر انسان، چرند و پرند اور پیڑ پودوں کی ضرورت ہے اور پیاس بجھانے کے لیے واحد قدرتی شے پانی ہے، جو سب کی پیاس بجھاتا ہے، اسی لیے قدرت کا یہ انتظام ہے کہ پانی کو اللہ میاں نے بہت کثیر مقدار میں پیدا کیا ہے اور وہ بھی بغیر قیمت مہیا کراتا ہے۔ دریا، جھیل، جھرنے، سمندر، بارش، کنویں اور ہینڈ پمپ کے ذریعے زمین سے حاصل ہونے والا

پانی سب فری ہی تو ملتا ہے۔ اس لیے قدرت نے خشکی یعنی زمین دنیا میں صرف ایک حصہ جب کہ پانی کے تین حصے بنائے ہیں۔ اس لیے انسان کے جسم میں بھی تقریباً 67% پانی اور 33% دیگر رقیق چیزیں ہیں۔ قدرت کا انتظام نرالا ہے اور انسانی سمجھ سے بالاتر۔

بچو! آج ہم آپ کو ایسی ہی ایک حقیقت سے آشنا کراتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ کیڑوں، مکوڑوں، پتنگوں وغیرہ کو بھی پیاس لگتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ برازیل کے جنگلات میں ایک ایسا پتنگا (موتھ) پایا گیا ہے جو پرندوں کے آنسوؤں سے اپنی پیاس بجھاتا ہے، برازیل کے ماہر حیاتیات لیانڈرو مورائس (Leandro Moraes) نے ایک اندھیری رات میں ایک شاخ پر ایک چھوٹے پرندے، جو Antibird کہلاتا ہے کو دیکھا۔ یہ پتنگا 'گورگون میکاریہ' (Gorgone macarea) کہلاتا ہے۔ وہ اپنی لمبی زبان (Long Proboscis) سے اس اینٹی برڈ کی آنکھ کی نمی چوس رہا تھا۔

ماہرین نے اس سے قبل بھی تتلیوں اور پتنگوں کو مگرمچھوں، کچھوؤں اور میمل (Mamal) کے آنسو پیتے دیکھا ہے۔ یہ عمل دراصل ان کی غذائی ضرورت بالخصوص نمک اور پروٹین حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ لیانڈرو مورائس نے اس واقعہ کی رپورٹ ایکولوجی (Ecology) رسالہ میں شائع کرائی تھی۔

زخم محسوس کرنے والے پودے

بچو! آپ کے علم میں ہے کہ انسانی بدن ہر طرح کی

تکلیف محسوس کرتا ہے۔ درد، بخار، چوٹ، زخم وغیرہ لیکن زخم اکثر چوٹ سے ہی آتے ہیں اور وہ اپنے ساتھ درد بھی لاتے ہیں، اس لیے میرا ایسا ماننا ہے کہ ان سب تکالیف میں زخم ہی سپریم ہے اور یہ بات اس لیے بھی تقویت پاتی ہے کہ پودے بھی زخم محسوس کرتے ہیں اور یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ جانوروں کی طرح پودے بھی زخمی ہونے پر ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ یہ پھول پودے جو ہماری فضا اور ماحول کو خوشبوؤں سے معطر کرتے ہیں اور اسے رنگین اور دلکش بناتے ہیں بلکہ بہت سی نامناسب گیسوں کو اپنے اندر سمو کر ہم کو تازی ہوا اور آکسیجن بخشتے ہیں۔ Sensitive ہوتے ہیں یعنی احساس رکھتے ہیں۔ میڈیسن شہر جو ویسکونسن کا دارالحکومت ہے اس کی یونیورسٹی آف وسکونسن میں کی گئی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ پودے بھی جانوروں کی طرح کوئی خطرہ محسوس کرنے پر دوسرے حصوں کو فوراً آگاہ کرتے ہیں، ہرچند جانوروں میں موجود مکمل اعصابی نظام کی طرح ایسا کوئی نظام پودوں میں نہیں ہے لیکن چونکہ نباتات بھی جانوروں کی طرح حس رکھتے ہیں، اس لیے وہ بغیر کسی اعصابی نظام کے باوجود بھی یہ کام کرتے ہیں۔ وہ خوشی سے مسکراتے بھی ہیں اور تکلیف پر روتے بھی ہیں، ایسا سائنسدانوں کا خیال ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ مثبت اور منفی یعنی Positive اور Negative اثرات کو محسوس کر لیتے ہیں اور جب بھی کوئی کیڑا پودے کے تنے یا پتے پر حملہ کرتا ہے تو ان میں سے ایک قسم کا مولیکیول (Molecule) نکلتا ہے جس سے پودے کے دیگر حصے اس خطرے سے آگاہ ہو کر اپنا دماغی نظام حرکت میں لے آتے ہیں۔ سائنٹسٹ نے اس کے لیے Florescent فلوریسنٹ پروٹین استعمال کیا جس سے کیڑے کے حملے کی وجہ سے اس کے نکلتے ہوئے ان سگنلس کو دیکھا جا سکتا ہے جو پودے کے دوسرے حصے کو جا رہے ہوتے ہیں۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ پودے کو اس طرح کا نقصان پہنچنے پر ایک برقیاتی چارج (Electrical Charge) نکل کر پودے کے دوسرے حصوں تک پہنچ جاتا ہے۔

موت سے ہم کنار کرنے والا مشروم (فنگس)

آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ابھی حال ہی میں دنیا کی خطرناک ترین اور جان لیوا 'فنگس' پھپھوندی آسٹریلیا کے دور دراز علاقوں میں پہلی مرتبہ دریافت کی گئی اس قسم کی فنگس جاپان اور کوریا میں بھی پہلے مل چکی ہے جس کو جیمس کک James Cook یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے پہچانا تھا اور اس کو پوائزن فائر کورل فنگس Poison Fire Coral Fungus کہا جاتا ہے۔ اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور لوگ اسے مشروم سمجھ کر چائے میں ڈال کر یا کھانے کی طرح استعمال کرتے رہے اور مرتے رہے کیونکہ یہ زہریلی ہوتی ہے اور اس کا زہر انسانی بدن میں داخل ہو کر اسے قے، ہیضہ، ڈائریا، جیسے امراض میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بدن سن ہو جاتا ہے اور اس کو بخار ہو جاتا ہے۔ یہ مشروم بھی فنگس کی ہی ایک قسم ہوتی ہے اور اس فنگس کے زہر کا اثر چھونے سے بھی ہو سکتا ہے جو پہلے دماغ پر اثر کرتا ہے اور بعد میں کئی ضروری اعضا کو متاثر کرتا ہے جو انسان کی موت کا باعث بنتے ہیں۔ ■

H M Yaseen
425/13, Beerbal Sahni Marg
New Hydrabad
Lucknow - 226007 (UP)

شمیم اقبال خاں

کوے کے بارے میں بھی کچھ جانیں

قابیل اور ہابیل حضرت آدمؑ کے بیٹے تھے۔قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔ دنیا کا یہ پہلا قتل تھا، پہلی لاش تھی اور پہلی تدفین بھی ہونی تھی۔قابیل اپنے بھائی کی لاش کو اپنی پیٹھ پر لاد کر ٹہلتا رہا۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس لاش کا وہ کیا کرے؟ تبھی اس نے دو کوّوں کو لڑتے ہوئے دیکھا۔اس لڑائی میں ایک کوّا مر گیا،تو دوسرے کوّے نے اپنی چونچ سے ایک گڈھا کھودا اور مرے ہوئے کوّے کو اس گڑھے میں ڈال کر مٹی سے ڈھک دیا۔قابیل نے بھی ایسا ہی کیا اور اپنے بھائی کو دفن کر دیا۔اس طرح سے کوے نے ابن آدم کو تدفین کا طریقہ سکھایا۔اسی وقت سے کوا، کان کو ناگوار لگنے والی کاؤں کاؤں کی آواز کے ساتھ انسانوں کے بیچ رہتا آرہا ہے۔

کوے بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ان کی چالاکی کے سلسلے میں ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔'ایک کوے نے اپنے بچے سے کہا کہ دیکھو! یہ دو پیر والے انسان بڑے خطرناک ہوتے ہیں،ان سے ہوشیار رہنا۔جیسے ہی یہ زمین سے ڈھیلہ اُٹھانے کے لیے جھکیں، فوراً اُڑ جانا۔نئی نسل کے بچے بھلے ہی وہ کوے کے ہی کیوں نہ ہوں، ہوشیار ہوتے ہیں، کہنے لگا اگر وہ ڈھیلہ گھر سے ہی لے کر آئے تو؟'۔کوا سمجھ گیا اب اس کو مزید تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی ہوشیاری کے باوجود ہی کوئل اس کو بہت آسانی سے بیوقوف بنا دیتی ہے۔کوئل انڈا ضرور دیتی ہے لیکن گھونسلہ نہیں بناتی۔ اپنے انڈے کوے کے گھونسلے میں دے آتی ہے جسے کوّا اپنے انڈے سمجھ کر سیتا ہے۔

کوے اور انسان ساتھ ساتھ رہتے چلے آرہے ہیں لیکن

ہم کووں کے بارے میں کیا کیا جانتے ہیں، سب سے پہلے اس پر غور کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں کووں کی 40 اقسام پائی جاتی ہیں۔ 'کورویڈیا خاندان (Corvidae family)' سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ ویسے تو بھارت میں کووں کی 6/اقسام پائی جاتی ہیں لیکن ڈاکٹر سالم علی جو چڑیوں کے ماہر مانے جاتے ہیں، انھوں نے صرف دو قسم کے ہی کووں کا ذکر کیا ہے، ایک تو گھریلو اور دوسرا جنگلی۔ ارسطو نے اپنی کتاب 'لغات الحیوان' میں کوے کی چار قسمیں بتائی ہیں جو رنگوں کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔

آسمان میں اُڑنے والے پرندوں میں کوا سب سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔ اس کی چونچ، سر، پیر، پر اور دُم سیاہ ہوتے ہیں صرف گردن سرمئی رنگ کی ہوتی ہے۔ کوے کے دماغ کی بناوٹ انسانوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس کی ہوشیاری سات سال کی عمر کے بچے جیسی ہوتی ہے۔ یہ بہت پھرتیلے اور غضب کی یاداشت والے ہوتے ہیں۔ اگر انھوں نے نقصان پہنچانے والے کسی انسان کا چہرہ اپنے دماغ میں بٹھا لیا تو کبھی بھولتے نہیں ہیں بلکہ اپنی برادری کے کووں کو بھی پہچان کرا دیتے ہیں۔ ان کی عمر دس سے پندرہ سال کی ہوتی ہے اور آسٹریلیئن کوا 22/سال تک زندہ رہتا ہے۔

کوے کا سائنسی نام ہے' کاروس براچر ہینچوس (Corvus brachyrhynchos)'۔ انٹارکٹکا کو چھوڑ کر کوے دنیا کے ہر کونے میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا کا سب سے چھوٹا کوا 'میکسکو' میں پایا گیا جس کا وزن محض 40/گرام ہوتا ہے۔ اس کے برعکس 'اتھوپیا' میں دنیا کا سب سے بڑا کوا پایا گیا جس کی لمبائی 65/سنٹی میٹر اور وزن 1.5/کلو ہوتا ہے۔

اس کی نظر بہت تیز ہوتی ہے جو اسے خوراک اور دشمنوں سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ خاص طور سے انسان سے محتاط رہتا ہے اور خطرے کی صورت میں کائیں کائیں کر کے اپنی برادری کو اکٹھا کر لیتا ہے۔ یہ اپنے انڈوں اور بچوں کی بڑی حفاظت کرتا ہے۔ آس پاس میں چیل اور بلّی کو دیکھتا ہے تو اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور اس کو بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اگر کوئی انسان اس کے گھونسلے سے انڈا نکالنے کی کوشش کرے تو کوے چونچ مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔

کوا کچا اور پکا ہوا گوشت بڑے شوق سے کھاتا ہے، بلکہ جس طرح چین کا باشندہ یعنی 'چینی' ہر وہ چیز کھاتا ہے جو اس کو اچھی لگتی ہو اُسی طرح کوا بھی مردار، سڑی گلی چزیں سب کھا لیتا ہے، اس کو سب اچھا لگتا ہے۔ دودھ کی پتیلی سے ڈھکّن ہٹا کر دودھ پی جاتا ہے۔ بچوں کے ہاتھوں سے روٹی، بسکٹ وغیرہ چھین کر کھا جاتا ہے۔ کچھ کوے کمزور بچھڑے اور بڑوں کا تازہ گوشت کھانے کی لالچ میں انھیں مار دیتے ہیں۔ اگر کوئی سخت چھلکے والی چیز مل گئی ہے اور اس کو توڑ نہیں پا رہے ہیں تو اس کو اس سڑک پر ڈال دیں گے جہاں زیادہ گاڑیاں چل رہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں چھلکا ٹوٹ جاتا ہے اور گودا نکل آتا ہے۔ جب لال بتّی پر ٹرافک رُک جاتی ہے تو یہ گودے کو کھا لیتا ہے۔

پہلے کے بنے ہوئے مکانوں میں آنگن بھی ہوتے تھے اور منڈیر بھی ہوا کرتی تھی۔ ان پر کوا جب بیٹھ کر کاؤں کاؤں کرتا تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ کوئی مہمان آنے والا ہے۔ اب مکانوں میں نہ آنگن ہوتے ہیں نہ منڈیر۔ ہندو دھرم میں کوے کی بڑی اہمیت ہے۔ کہتے ہیں کہ مذہبی کتاب 'پُران' میں اس

کو جنّت کا سب سے قریبی پرندہ مانا جاتا ہے۔شرادھ میں اس کی پوجا کی جاتی ہے۔اپنے مُردوں کو کھانا ان کی ہی معرفت کھلایا جاتا ہے۔ہندو ایسا مانتے ہیں کہ انسان مر کر کوے کی شکل میں پہلا جنم لیتا ہے۔ان کی یہ بھی آستھا ہے کہ کوے کو کھانا کھلانے سے ان کے مرحومین کو کھانا ملتا ہے۔ایک تھالی میں طرح طرح کے پکوان سجا کر چھت پر رکھ دیتے ہیں۔اگر کوا جلد ہی کھانے آجاتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ ان کے 'پوروج' بہت خوش ہیں۔اور اگر کسی کے یہاں کوئی کوا دیر تک کھانے نہیں آتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ 'پوروج' ناراض ہیں اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی جاتی ہے۔ پیڑوں کے کٹان اور دیگر وجوہات کی بنا پر شہروں سے کوے ختم ہو رہے ہیں۔ایسی صورت میں سارا سارا دن تھالی چھتوں پر رکھی رہ جاتی ہے پھر یہ تھالی گائے یا دیگر جانوروں کو کھلا دی جاتی ہے۔

ان حالات پر طنز کرتے ہوئے سنت کبیر داس کا ایک دوہا ہے:

''زندہ باپ کوئی نہ پوجے مرے بعد پجوائے ::: مٹھی بھر چاول لے کر کوے کو باپ بنائے''

کووں کی زندگی سے بہت دلچسپ باتیں منسوب ہیں۔ جب کوئی کوا زخمی ہو جاتا ہے یا مرنے والا ہوتا ہے تو سارے کوے مل کر اس پر حملہ کرتے ہیں اور اُسے جلدی مار دیتے ہیں۔کوا اپنی مادہ کا بہت وفادار ہوتا ہے،ایک بار جس سے جسمانی تعلق قائم کر لیتا ہے زندگی بھر اسی کے ساتھ رہتا ہے۔ جب مادہ انڈے سیتی ہے تو نر ان کی حفاظت کرتا ہے۔نر و مادہ دونوں مل کر اپنے بچے کو پالتے ہیں۔

کوے اپنی عدالت بھی منعقد کرتے ہیں۔اگر کسی کوے نے کسی بچہ کوے سے اس کا کھانا چھین کر کھا لیا ہے تو گھیرا باندھ کر کوے بیٹھتے ہیں،پنچایت کرتے ہیں اور مجرم کوے کو سزا دیتے ہیں۔

کوے کا ذکر ہر معاشرے کے قصے کہانیوں میں ملتا ہے، کئی شاعروں نے اسے اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے اور کئی لوک گیت اور فلمی گانوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔جیسے ''جا جا رے کا گا...''، ''جھوٹ بولے کوا کاٹے...'' وغیرہ۔کچھ مشہور شاعروں نے اپنے اشعار میں کوے کا ذکر کیا ہے:

دلچسپ ہو سکا نہ کبھی شیخ کا بیان
کوّا غریب مرغِ خوش الحاں نہ ہو سکا — شوق بہرائچی

بادل انڈے ہیں آگ برسے گی
باغ مہکے ہیں زاغ بولیں گے — احمد ندیم قاسمی

پھر کاگا بولا میرے گھر کے آنگن میں
پھر امرت رس کی بوند پڑی تم یاد آئے — ناصر کاظمی

دل شکستہ کیوں نہ ہوں شاہین و باز
ہیں فضا میں پرفشاں زاغ و زغن — فرید تنویر

دن دہاڑے کبوتروں کا عشق
پانی پانی ہیں شرم سے کوّے — عقیل جامد

مکّار نے ہر حال میں سیدھے کیے الّو
کوئل کے سہارے پہ سدا کاک رہے ہیں — خواجہ جاوید اختر

جس طرح کوّا دنیا کے ہر خطہ میں پایا جاتا ہے، اسی طرح یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ہر شاعر نے اپنے کلام میں کوّے کو عزت بخش کر اپنا کلام معتبر بنایا ہو،لیکن بہت سے شاعروں نے ایسا کیا ہے۔ یہاں تک کہ شاعرِ مشرق علامہ

اقبال کے کلام میں بھی کوّا موجود ہے:

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ   علامہ اقبال

شاعری کے علاوہ ہندی، اردو اور انگریزی ادب میں بھی بہت سے محاورے استعمال کیے گئے ہیں جن میں کوے کا ذکر ہے۔ مثال کے طور پر کچھ محاورے دیے جا رہے ہیں:

(1) پڑھوں میں انپڑھ جیسے بگلوں میں کوا یعنی بڑے لوگوں میں چھوٹوں کی حیثیت کیا ہے؟
(2) دولت منڈیر کا کوا ہے یعنی دولت کبھی ایک جگہ نہیں رکتی۔
(3) کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی چال بھول گیا۔
(4) کوا کان لے گیا۔
(5) کوے کو سا کریں کھیت پکا کریں۔

انگریزی ادب میں بھی کوے کو خاصی جگہ دی گئی ہے کچھ مثالیں ذیل میں پیش ہیں:

(1) be up with the crows یعنی کوے کی طرح صبح اُٹھنا اور کام پر لگ جانا۔
(2) as the crow flies یعنی کوّا ہمیشہ ایک سیدھی لائن میں اُڑتا ہے۔

سائنس دانوں نے بھی کوے کو نہیں چھوڑا ۔کیمبرج یونیورسٹی کے مسٹر کرسٹوفر برڈ اور اس کی ٹیم نے اپنے ایک سائنسی تجربے میں 'پیاسا کوا کہانی' کی تصدیق کی جس میں کوے نے گھڑے میں کنکر ڈال کر پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی تھی۔ اسی طرح برمنگھم یونیورسٹی کے ماہرین کی ایک ٹیم کو جنگلی کووں پر 1800 گھنٹوں سے زیادہ کی ویڈیو رکارڈنگ کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ درختوں کے تنوں اور چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے اپنی خوراک نکالنے کے لیے کوا کئی طرح کے اوزار استعمال کرتا ہے۔ اس کے اوزار نوکدار تنکے اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ہوتی ہیں اور وہ خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ کس جگہ کے لیے کس سائز کا اوزار مناسب رہے گا۔

کوے کی ذہانت سائنس دانوں کی توجہ کا خاص مرکز ہے اور دنیا بھر کی مختلف یونیورسٹیوں میں اس حوالے سے اس پر تجربات کیے جاتے ہیں۔ جاپان کی ٹوکیو یونیورسٹی آف اگری کلچر میں ماہرین کی ایک ٹیم نے کووں پر دلچسپ تجربات کیے۔ تجربات کے لیے انھوں نے سدھائے ہوئے کووں کے بجائے جاپان کے شہروں اور قصبوں میں پائے جانے والے چار جنگلی کوے لیے اور ان کو ایسی عورتوں اور مردوں کی رنگین تصویریں دکھائی گئیں جن کے سر کے بال چھپا دیے گئے تھے تاکہ ان کے جنس کے تعین میں مشکل پیش آئے۔ اکثر جاپانی مردوں کی داڑھی مونچھ نہیں ہوتی ہے اور اگر جاپانی مردوں اور عورتوں کے سر کے بال ڈھانپ دیے جائیں تو ان کی شناخت میں دقت پیش آسکتی ہے۔

سائنس دانوں نے دو دو کووں کے دو گروپ بنائے، ایک گروپ کو عورت کی تصویر جبکہ دوسرے کو مرد کی تصویر چننے کی تربیت دی۔ اس تربیت کے دوران جب کوے صحیح تصویر چنتے تھے تو انعام کے طور پر انہیں پنیر کا ایک ٹکڑا کھانے کے لیے دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ان تصویروں میں مزید بہت سی تصویریں شامل کر دی گئیں اور انہیں تاش کے پتوں کی طرح پھینٹ دیا گیا تاکہ کوے ان کی ترتیب بھول جائیں۔ تجربوں کے دوران چار میں سے تین کووں نے ہر بار صحیح تصویر کا

انتخاب کیا اور ان کی شناخت سو فی صد تک درست رہی جبکہ چوتھے کوے نے دس میں سے سات بار بالکل درست انتخاب کیا۔ ماہرین کی ٹیم کا کہنا ہے کہ ان تجربات سے انہیں یہ معلوم ہوا کہ کوے عورت اور مرد میں چاہے ان کا حلیہ بدل ہی کیوں نہ دیا جائے بخوبی تمیز کر سکتے ہیں۔

کسی نے یہ تجربہ کیا جس کا وڈیو انٹرنٹ پر موجود ہے۔ دو جار لیے گئے جس میں ایک چوڑے منہ اور ایک چھوٹے منہ والا تھا۔ دونوں میں پانی آدھے سے زیادہ بھر دیا گیا اور دونوں جار کے پانی کی سطح ایک سی رکھی گئی۔ ان میں پانی کی سطح پر کوے کے کھانے لائق کوئی چیز ڈالی گئی۔ ایک کوا آیا اور دونوں جار سے کھانے والی چیز کو پکڑنا چاہا لیکن کامیاب نہیں ہوا کیونکہ سطح نیچی تھی۔ پاس میں ہی موٹے موٹے کنکر پڑے تھے، کوے نے ایک کنکر اُٹھا کر بڑے منہ والے جار میں ڈالا۔ دوسرا کنکر اُس نے چھوٹے منہ والے جار میں ڈالا، اس کے بعد دو تین کنکر اور اسی جار میں ڈالے۔ پانی کی سطح اوپر آئی اور اُس نے کھانے والی چیز کو اپنی چونچ میں دبایا اور اُڑ گیا۔ اس تجربہ سے یہی ثابت ہوا کہ کوے کو پانی کی سطح کے اتار چڑھاؤ کا بھی پوری طرح سے علم ہے۔

■

Shamim Eqbal Khan
23/160 Prakash Lok Extn
Indira Nagar
Lucknow - 226016 (UP)

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............................ بتاریخ............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

عبدالشاہد

ڈاکٹر سالم علی: ماہرِ پرند

نو، دس برس کی عمر کا معصوم سا لڑکا ہاتھ میں ہوائی بندوق لیے جنگل میں آزادانہ طریقے سے گھوم رہا تھا۔ پرندوں کی میٹھی آوازیں سنتا اور آگے بڑھ جاتا لیکن اب کی بار وہ ایک گھنے درخت کے سائے میں رک گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اسے مسرور کر دیا لیکن وہ پرندوں کی آوازوں پر دھیان رکھے ہوئے تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک مدھر آواز سنائی دی۔ درخت کی شاخ پر ایک چھوٹی سی چڑیا چہک رہی تھی۔ لڑکے نے اس آواز کی جانب بندوق کو تانا، نشانہ لگایا اور کھٹاک کی آواز کے ساتھ پرندے کی آخری چیخ سنائی دی۔ چند لمحوں میں وہ پرندہ زمین پر آ گرا۔ تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد پرندہ بے جان ہو گیا۔ لڑکے نے اسے اٹھایا۔ اور غور سے دیکھا۔ لیکن یہ کیا؟ یہ تو ایک عجیب و غریب چڑیا ہے۔ سب سے الگ تھلگ اس طرح کی چڑیا اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے گلے کے نیچے ہلدی جیسے پیلے رنگ کا دھبہ تھا۔ بہت دیر غور کرنے کے بعد اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ چڑیا کو لے کر اپنے چچا معین الدین کے پاس پہنچا جو اس وقت بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی (BNHS) میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ وہ بھی اس چڑیا کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے۔ آخر کار BNHS کے سکریٹری ملّارڈ نے اس معمہ کو سلجھایا۔ آپ کو معلوم ہے چھوٹی سی چڑیا کا شکار کرنے والا وہ لڑکا کون تھا؟ جی وہ لڑکا سالم علی تھا جو مستقبل میں ایک عظیم ماہرِ پرند کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ ملّارڈ نے بتایا کہ یہ ایک منفرد قسم کے پیلے گلے Yellow thrated کی چڑیا ہے جو قرب وجوار میں پائی جاتی ہے۔ ملّارڈ نے BNHS کے میوزیم میں کئی پرندوں کے ماڈل، نمونے، فوٹو گراف اور چارٹ سالم علی کو بتائے اور 2 کتابیں 'کامن برڈس آف بامبے' اور 'نیچر لسٹ

آن پراول' پڑھنے کے لیے اسے تحفتاً دیں۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد سالم علی کے دل میں ماہر پرند بننے کی تمنا جاگ اٹھی اور اسے پورا کرنے کے لیے انھوں نے جدوجہد بھی شروع کردی۔

سالم علی کی پیدائش 12 نومبر 1896 کو گرگام (کھیت واڑی) ممبئی میں ہوئی۔ والد معزالدین اور والدہ زینت النسا کی نو اولادوں میں سالم علی سب سے چھوٹے تھے۔ پرندوں کا رہن سہن، گھونسلوں کی بناوٹ، کھانے پینے وغیرہ کا معائنہ کرنے کے لیے وہ جنگل میں میلوں دور نکل جاتے۔ 1913 میں مشن اسکول ممبئی سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ زولوجی میں گریجویشن کی غرض سے انھوں نے کالج میں داخلہ لیا لیکن لوگارتھم اور ریاضی ان کے راستہ کے پتھر بن گئے۔ تعلیم ادھوری چھوڑ کر 17-1914 کے درمیان وہ برما میں کاروبار کے سلسلے میں مقیم ہوگئے۔ کاروبار کی خشک فائلوں میں انھیں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ یہیں پر ان کی ملاقات جے، سی، ہوپ، ہوڈ سے ہوئی جو برما کے ڈیویزنل فارسٹ آفیسر تھے۔ ان کے پاس برمی پرندوں کی معلومات کا بہت بڑا خزانہ تھا۔ سالم علی نے اس خزانہ سے بہت سی معلومات حاصل کیں۔

چند سال کے لیے ایک کاٹن ایکسپورٹنگ کمپنی میں ملازمت کی غرض سے وہ جرمنی میں بھی مقیم رہے۔ یہاں ان کی ملاقات برلن یونیورسٹی کے زولوجیکل میوزیم کے صدر مسٹر برنارڈ رینچ Bernard Rensch سے ہوئی۔ پرندوں کی دنیا کی باریکیوں کو سمجھنے کا انھیں موقع ملا۔ جرمنی سے واپس آنے کے بعد وہ ہندوستان میں اسی موضوع پر تحقیق کرنے لگے۔ ممبئی میں ان کی ملاقات سینٹ زیویرس کالج کے شعبۂ حیاتیات کے صدر فادر بلنٹر (Father Blunter) سے ہوئی۔ انھوں نے سالم علی کو پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے قبول کیا۔ کالج کی تعلیم کے بعد سالم علی کا زیادہ تر وقت BNHS کی لائبریری اور لیب میں گزرتا۔ 1918 میں وہ تہمینہ نامی خاتون سے رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ ان کی شریکِ حیات بھی ان کے تحقیقی کاموں میں معاون ثابت ہوئی۔

ابتدا میں سالم علی نے کئی پروجیکٹ بنا کر جنگلی پرندوں کی زندگی پر چھوٹی چھوٹی فلمیں اور تصاویر شائع کیں۔ ان معلوماتی فلموں کو لے کر وہ کالج اور اسکول پہنچ جایا کرتے اور پروجیکٹر کی مدد سے پرندوں کی نسل، رنگ روپ، رہن سہن، غذا، اور نظام جنت کی تفصیلی معلومات دیتے جو دلچسپی سے دیکھی جاتی۔ کالج کے اساتذہ اور طلبا ان کے اس کارنامے سے کافی خوش ہوتے اور انھیں ستائش سے نوازتے۔

1930 سے 1955 کے دوران انھوں نے BNHS کے توسط سے برصغیر کے قریب قریب تمام جنگلات کا سروے کیا۔ سر پر چھوٹی سی ٹوپی، کیمرہ، دوربین، پیڈ اور پینسل لیے وہ اپنے تحقیقی سفر پر نکل جاتے، جہاں نہ انھیں بھوک ستاتی، نہ نیند بے چین کرتی۔ BNHS سے شائع ہونے والے جریدے میں ان کے مضامین قسط وار چھپنے لگے۔ اسی دوران ان کی پہلی تصنیف 'دی اسٹڈی آف انڈین برڈس' وجود میں آئی۔ اس کتاب نے پرندوں کے سائنس Orinthology میں دھوم مچا دی۔ یورپ کے کئی ماہرین اس سے کافی متاثر ہوئے۔ مشہور انگریزی ماہرِ پرند ہیوو سلر نے اسے ایک سنگ میل سے تعبیر کیا۔ ان پچیس برسوں میں انھوں نے پیدل سفر

کر کے پرندوں کا سروے اور گنتی بھی کی۔ میسور، تراونکور، کوچین، بھوپال، گوالیار، بہاولپور، بھرت پور، کیرل، سکم، ہماچل پردیش جیسے علاقے ان کے مطالعے کا موضوع بنے۔ کسی نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ گاندھی جی کے بعد دوسرے ہندوستانی تھے جس نے اتنا لمبا سفر پیدل طے کیا۔ ان کی انتھک جدوجہد جاری رہی۔ بنگلور سے شائع ہونے والے رسالے 'کرنٹ سائنس' کا وہ تاریخی یادگار جملہ تمام سائنس کے طلبا کو آج بھی ازبر یاد ہے۔ انھوں نے لکھا ''شاید انسان کے بنا پرندے زندہ رہ سکیں گے لیکن پرندوں کے بنا انسان کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔''

عمر کی سترہویں منزل پر پہنچنے کے بعد بھی سالم علی کا ٹائپ رائٹر گھنٹوں ٹپ ٹپ کرتا رہتا۔ پہاڑوں کی بلندیوں پر اور چٹیل میدان میں بھی انھیں صرف پرندوں کی زندگی کی فکر ہوتی۔ اسی کے نتیجے میں بے مثال تصانیف وجود میں آئیں۔ مثلاً دی بک آف انڈین برڈس، دی برڈس آف انڈیا اینڈ پاکستان (دس جلدوں میں)، انڈین ہل برڈس، دی برڈس آف کیرالہ، دی برڈس آف سکم، دی برڈس آف ٹراونکور وغیرہ۔ دھیرے دھیرے سالم علی کا نام اور ان کی تصانیف درس گاہوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچنے لگیں۔ آندھرا یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ دلی اور لدھیانہ یونیورسٹی نے بھی پہلی مرتبہ سالم علی کے مضامین نصاب میں شامل کیے۔ اس طرح کی قبولیت سالم علی کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی۔

1958 میں وزیرِ اعظم جواہر لعل نہرو نے انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا۔ اسی دن سے عوام انھیں جاننے اور پہچاننے لگے۔ اخبارات، رسائل اور ماہناموں میں سالم علی کا تعارف پیش کیا گیا اور ان کے لکھے ہوئے تحقیقی مضامین بھی پیش کیے گئے۔ تصاویر اور حالاتِ زندگی بھی اخباروں کے صفحات پر دمکنے لگے۔ 1976 میں امریکہ کا سب سے بڑا ایوارڈ 'پال گیٹی ایوارڈ' انھیں عطا کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ان دنوں نوبل انعام کے بعد سب سے بڑا ایوارڈ تصور کیا جاتا تھا۔ اس انعام کے ساتھ ملی ہوئی پچاس ہزار ڈالر کی رقم سالم علی نے تحفظِ پرند و تحفظ ماحولیات کے لیے وقف کر دی۔ اسی سال وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی نے انھیں پدم وی بھوشن سے سرفراز کیا۔ انعام واکرام حاصل ہونے کی وجہ سے سالم علی کو سب سے پہلا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مدتوں میڈیا میں چھائے رہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ حکومت کی نظرِ عنایت بھی ہونے لگی۔ مرکزی حکومت کی جانب سے ایک ایمبولینس اور ایکسپرٹ ڈاکٹرس ہمیشہ ان کی خدمت میں حاضر رہتے۔

سالم علی ماحولیات کی بربادی اور پرندوں کی تباہی پر ہمیشہ فکرمند رہتے۔ ایک انٹرویو کے دوران انھوں نے کہا ''ہم نے غلط طور سے اپنی پسندیدگیاں اختیار کی ہیں۔ ہمارے جنگلات کی بربادی دراصل ہمارے بال و پر کی بربادی ہے۔

ہمارے پرندوں کو اصل نقصان جنگلات کی کٹائی سے ہو رہا ہے۔ ترقی کی غلط اور احمقانہ تعبیر کی وجہ سے ہم نے کلی طور سے ماحولیات کو ختم کر دیا۔ صنعتیات کے نام پر ہم نے پرندوں کی زندگی کو موت میں تبدیل کر دیا۔" ہندوستانی Orienthology (پرندوں کا علم) کے باوا آدم آگے فرماتے ہیں "تم جب کسی زندگی کی ایک شکل کو نظر انداز کرتے ہو تو سمجھ لو زندگی کی ہر شکل کو نظر انداز کرتے ہو۔ ایک قاتل آخر قاتل ہے، چاہے اس نے کسی پرندہ کو قتل کیا ہو یا کسی شخص کو۔ ہمیں تمام زندگیوں کو سمجھنا چاہیے۔"

سالم علی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دہلی اور آندھرا یونیورسٹی سے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل ہوئی۔ 1983 میں انھیں وائلڈ لائف عالمی فیڈریشن سے ایوارڈ حاصل ہوا۔ اور 1984 میں راجیہ سبھا کی رکنیت۔ الغرض پرندوں کا یہ مسیحا بغیر رکے، بغیر تھکے زندگی کی آخری سانس تک کام کرتا رہا۔ اپنی موت سے چند مہینے پہلے ان کی خودنوشت The fall of a Sparrow کا اجرا کیا گیا۔ 91 برس کی عمر میں 20 جون 1987 کو آپ نے وفات پائی۔

بقول علامہ اقبال۔

زندگی انسان کی مانند مرغِ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

■

Abdul Shahed
Rahmat Nagar
PUSAD - 445204
Distt: Yavatmal (Maharashtra)
Mob.: 8149711656

جوابات

منور حسن کمال

ڈیجیٹل لائبریری

آج کے زمانے میں انٹرنیٹ ایک ایسا لفظ ہے، جس کو ہر کوئی جانتا ہے۔ اس کے حقیقی معنی سے چاہے واقف نہ ہو، لیکن اس کا استعمال کیسے کیا جاتا ہے، اس سے دنیا کا ایک بڑا طبقہ واقف ہے اور انٹرنیٹ کو کسی نعمت سے کم بھی نہیں جانا جاتا ہے۔ کیونکہ انٹرنیٹ نے آج پوری دنیا کو ایک جگہ جوڑ دیا ہے۔ اگر انٹرنیٹ کے آغاز کی بات کریں تو 1967 میں امریکی محکمۂ دفاع میں ایڈوانس ریسرچ پروجیکٹ ایجنسی (Advance Research Agency [ARA] کے نام سے نیٹ ورک لانچ کیا گیا تھا، جس کا استعمال پوشیدہ خبریں بھیجنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ سب کچھ انٹرنیٹ کی مدد سے ہی کیا جا رہا ہے... اور اب تعلیم کا سلسلہ بھی آن لائن ہو رہا ہے۔ بعض جگہوں پر اس کا آغاز ہو چکا ہے اور بعض جگہ اس کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ آن لائن مطالعے کے لیے ڈیجیٹل لائبریری بھی بہت ضروری ہے۔ ہندوستان میں نیشنل ڈیجیٹل لائبریری آف انڈیا سب سے بڑی اور معتبر لائبریری ہے۔ یہاں پہلی جماعت سے ریسرچ تک کے لیے آن لائن کتابیں موجود ہیں۔ یوں بھی اگر غور کیا جائے تو عالمی سطح پر طلبہ کی بڑی تعداد کتابوں کے آن لائن مطالعے پر انحصار کرتی ہے۔

ڈیجیٹل لائبریری ایک ایسا کتاب گھر ہوتا ہے جس میں ڈاٹا ڈیجیٹل طریقوں سے جمع کیے جاتے ہیں اور کمپیوٹر کے ذریعے ان کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کو پہلی مرتبہ 1994 میں ڈیجیٹل لائبریری انیشیٹیو کے ذریعے مقبول بنایا گیا تھا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہمارا ملک بڑی تیزی سے 'ڈیجیٹل انڈیا' بنتا جا رہا ہے۔ حکومت روز نئے نئے ایپ اور منصوبے عوام کی سہولت کے لیے لے کر آ رہی ہے۔ اسی سلسلے میں قومی تعلیمی مشن پروجیکٹ کے تحت مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کھڑگ پور کے ساتھ مل کر اس پروجیکٹ کو شروع کیا ہے۔ اس پروجیکٹ میں تاریخ سے لے کر کمپیوٹر ٹیکنالوجی وغیرہ جیسے موضوعات کی کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ اسی طرح پہلی جماعت سے لے کر ریسرچ کے موضوعات کی کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ نہ صرف کتابیں بلکہ ان موضوعات پر آڈیو، ویڈیو پروگرامز بھی فراہم کیے گئے ہیں جن سے دنیا میں کہیں بھی گھر بیٹھے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ لائبریری طلبا کی ایک انگلی کے اشارے پر دستیاب ہے۔ یہاں انگریزی کے ساتھ ساتھ ملک کی کئی زبانوں میں کتابیں موجود ہیں۔ طلبہ کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے خصوصی طور پر موبائل ایپ بھی تیار کیا گیا ہے۔ حکومت کا مقصد اس لائبریری کے ذریعے طلبہ کو دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں اور تحقیقات سے واقف کرانا ہے۔ ڈیجیٹل لائبریری سے تعلیم کے میدان میں بہت بڑی تبدیلی سامنے آنے والی ہے اور مقامی طور پر گھر بیٹھے آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس سے غریب امیر کے درمیان کا فرق بھی ختم ہوگا۔ ہر ایک، فرقے اور طبقے کے

طلبہ اس سے برابر فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔

طلبہ کو صرف یہ کرنا ہے کہ اپنے ای۔میل کے ذریعے اس کے ای۔میل پر اپنا رجسٹریشن کرائیں، جس یونیورسٹی میں آپ پڑھ رہے ہیں اس کا نام اور اپنے کورس کا نام رجسٹریشن فارم میں بھرنا ہے۔اس کے بعد رجسٹرڈ ای-میل پر ایک لنک آئے گا۔ اس کے ساتھ ہی لائبریری کے ساتھ طالب علم کا رجسٹریشن مکمل ہوجائے گا۔خاص بات یہ ہے کہ طلبہ کے علاوہ عام آدمی بھی اس لائبریری سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

اس لائبریری میں گزشتہ دس برس میں جو نئے نصاب اور کتابیں سامنے آئی ہیں، ان میں سے بہت سی کتابیں اس لائبریری میں موجود ہیں۔ اس لائبریری میں ستر سے زیادہ زبانوں میں 65 لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں، جن کے مصنفین کی تعداد بھی دو لاکھ سے زیادہ ہے، ایک لاکھ سے زیادہ مضامین ہیں۔ ایک لاکھ ہندوستانی اسکالرس کے تھیس، مسودے اور اہم لیکچر سے بھی طلبہ فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

ڈیجیٹل لائبریری میں ای- کتاب کے ذریعے آپ کے مطالعے کو آسان بنایا جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی جان لیجیے کہ ای- کتاب کیا ہے؟

ای- کتاب کاغذ کے بجائے ڈیجیٹل شکل میں ہوتی ہے جسے کمپیوٹر اسکرین یا انڈرائڈ موبائل کی اسکرین پر پڑھا جاتا ہے۔ یہ کتابیں کئی طرح سے محفوظ ہوتی ہیں جس میں سب سے زیادہ چلن پی ڈی ایف فائل کا ہے اور یہ آسان بھی ہے۔

کمپیوٹر پر یا موبائل اسکرین پر ای- کتاب پڑھنے کے لیے ایک سافٹ ویئر کی ضرورت ہوتی ہے جسے ای- بک ریڈر کہا جاتا ہے۔ کمپیوٹر پر ٹائپ کی گئی کتابوں کو سافٹ ویئر کی مدد سے ای- کتاب کی شکل میں بدلا جاسکتا ہے۔ چھپی ہوئی کتابوں کو اسکینر کی مدد سے ڈیجیٹل شکل میں بدلا جاتا ہے۔

ڈیجیٹل لائبریری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ کو لائبریری جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا بھر کے افراد انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے کمپیوٹر اسکرین پر تمام ڈیجیٹل معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

ڈیجیٹل لائبریری کو کبھی بھی دن کے 24 گھنٹے اور سال کے 365 دن استعمال کیا جاتا ہے۔

ڈیجیٹل لائبریری میں ایک ہی طرح کی کتابوں پر کئی افراد کام کرسکتے ہیں۔

ڈیجیٹل لائبریری کے ذریعے ایک سے زیادہ طریقوں سے طلبہ کسی مواد تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیٹ لاگ سے کسی خاص کتاب اور پھر کسی خاص موضوع تک پہنچ سکتے ہیں۔

بہترین معیار کے ساتھ کسی بھی فن کی ایک کاپی آسانی سے تیار کی جاسکتی ہے۔

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک ڈیجیٹل لائبریری دوسری ڈیجیٹل لائبریری کی کسی بھی طرح کی کتاب کو بہت آسانی سے لنک فراہم کرتی ہے۔

ڈیجیٹل لائبریری تک رسائی بالکل آسان ہے۔ گوگل پر National Digital Library of India جیسے ہی آپ لکھیں گے ممبر شپ کا لاگ ان آپشن آپ کی اسکرین پر ہوگا۔

اب آگے بڑھیے اور ڈیجیٹل لائبریری سے فائدہ اٹھائیے۔

■

Munawwar Hasan Kamal
N-93, Fourth Floor
Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

آن لائن تعلیم وتدریس

جہاں ایک طرف پوری دنیا میں کورونا وائرس نے تباہی مچائی ہوئی ہے، وہیں اس وائرس کے کچھ مثبت پہلوؤں کی طرف نظر کرنا بھی ضروری ہے، جیسے ہمارے ماحولیات میں آلودگی کی کمی، ہواؤں کا صاف ہوجانا، دریا، سمندر، ندیوں کا صاف ہونا، وہیں ایک اہم مثبت پہلو ہمارے تعلیم وتدریس کے طریقہ کار میں تبدیلی بھی ہے کہ اس وائرس نے آن لائن تعلیم کا راستہ ہموار کیا ہے۔

ہمارے یہاں سرکاری سطح پر ڈیجیٹل (آن لائن) تعلیم وتدریس کے فروغ کے لیے کئی پروجیکٹ چل رہے ہیں۔ جیسے MOOCS اور اس کے علاوہ بھی کئی طرح کے پروجیکٹ موجود ہیں، لیکن ان پروجیکٹس کی رسائی عوامی سطح پر نہیں ہو پائی تھی۔ حالانکہ یہ تمام طرح کے ڈیجیٹل پروجیکٹ خاص طور سے انھیں لوگوں کے لیے تھے جو تعلیم سے کسی بھی وجہ سے محروم رہے ہوں۔

بنیادی طور پر SWAYAM حکومت ہند کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے اشتراک سے بیشتر تعلیمی آرگنائزیشن کا ایک مربوط تعلیمی پلیٹ فارم ہے جو MOOCS کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ ہر اسٹریم کا تعلیمی آرگنائزیشن اس میں شامل ہے مثال کے طور پر یو جی جی، اے آئی سی ٹی ای، اگنو، این سی ای آر ٹی اور این آئی او ایس وغیرہ۔ تقریبا تمام موضوعات کے کورس ہیں خواہ سائنس، آرٹس یا وہ کامرس ہو۔ اس بات سے انکار کرنا غیر

مناسب ہوگا کہ آج بھی پڑھا لکھا طبقہ اس ویب سائٹ سے استفادہ کررہا ہے۔

اس حقیقت سے بھی منہ نہیں موڑا جاسکتا کہ اس لاک ڈاؤن سے پہلے ان آن لائن (ڈیجیٹل) تعلیم کی اہمیت صرف ان لوگوں تک ہی محدود تھی جو اپنی دلچسپی سے ہی کوئی آن لائن کورس کرنا چاہتے ہوں یا اپنی ذاتی اور تعلیمی ترقی کے خواہش مند ہوں لیکن لاک ڈاؤن نے اس طرح کی ویب سائٹ سے سبھوں کو تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کردیا ہے، اسکول سے لے کر کالج تک، کالج سے لے کر یونیورسٹی تک غرضیکہ دنیا کے تمام تعلیمی ادارے آن لائن تعلیم فراہم کرنے کے لیے کوشاں ہیں اور کافی بہتر نتائج بھی حاصل ہورہے ہیں۔

آن لائن ایجوکشن ایکوسسٹم کو فروغ دینے کے لیے حکومت ہند نے 11/اپریل 2020 کو ایک تحریک 'بھارت پڑھے آن لائن' کا آغاز کیا جس میں 16/اپریل تک عام لوگوں سے تجاویز مانگی گئیں تاکہ اس لاک ڈاؤن میں تعلیمی سلسلے کو مزید تخلیقی اور دلچسپ بنایا جاسکے اور ابھی تک چار ہزار سے زائد تجاویز حاصل ہوچکی ہیں۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے آن لائن ایجوکیشن سسٹم میں مزید نت نئے تصورات کو جگہ ملے گی۔

اگر ہم وائرس کی وجہ سے آن لائن تعلیم کی شرح میں اضافے کے تخمینے پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ شرح پہلے کے مقابلے بہت زیادہ بڑھی ہے۔ راگھو گپتا، مینیجنگ ڈائرکٹر APAC and India,Coursera کا کہنا ہے کہ ''کورونا نے تقریبا ہر فرد کو آن لائن تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کردیا ہے۔'' انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ''بھارت کی تقریبا ہزاروں یونیورسٹیز اور کالجز میں 37 ملین سے بھی زیادہ طلبہ کا اندراج ہے اور وہ سبھی آن لائن تعلیم حاصل کررہے ہیں۔'' (Coursera آن لائن تعلیم فراہم کرنے والے دنیا کے بڑے پلیٹ فارموں میں سے ایک ہے۔) اپنا ملک جس کو ایک طرف اس وائرس نے بری طرح متاثر کیا وہیں دوسری طرف اچھی بات یہ ہے کہ یہاں کا تقریبا 180 بلین تعلیمی سیکٹر دنیا کی اس نئی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے آن لائن تعلیم کو فروغ دینے میں مصروف ہے۔ زیادہ تر تعلیمی ادارے ورچوئل Virtual انفراسٹرکچر کی نشوونما میں لگے ہوئے ہیں۔ تاکہ اس طرح کے لاک ڈاؤن یا ناگہانی صورت حال میں کوئی بھی تعلیم سے محروم نہ رہے۔ اس کے لیے انھوں نے Impartus Innovation, Amazon Web Services اور Coursera جیسی ٹکنالوجی کمپنی سے رابطہ کرنا شروع کردیا ہے۔ راگھو گپتا کے مطابق ہندوستان میں پچھلے سال کے مقابلے اس سال آن لائن ذریعہ تعلیم میں نئے رجسٹریشن کی شرح میں 537 فیصد کا اضافہ ہوا ہے جبکہ اندراج کی شرح میں 465 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ (اخبار: بزنس اسٹنڈرڈ، رائٹر: پیر زادہ ابرار اور سائی ایشور، تاریخ: 15 اپریل 2020)۔

Byju تعلیمی اپلیکشن کے فاؤنڈر بائجو رویندران نے مارچ کے شروع ہی میں اعلان کیا کہ اب وہ اپنے اپلیکشن پہ طلبہ کو مفت میں رسائی دیں گے تاکہ اس لاک ڈاؤن میں کوئی بھی تعلیم سے محروم نہ رہے۔ حالانکہ یہ ہندوستان کی پیڈ آن لائن تعلیم فراہم کرنے والی سب سے بڑی کمپنی ہے جس کے سبسکرائبر (صارفین) بھی 2019 میں تقریبا 40 ملین تھے۔

ابھی یہ ایپلیکیشن صرف انگریزی اور ہندی میں ہی خدمات فراہم کررہی ہے لیکن ملک کی دوسری علاقائی زبانوں میں بھی اس کو بنانے کی کوشش جاری ہے، وقت لگ سکتا ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ آنتھا دوریپا: یونیسکو کے مہاتما گاندھی انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن فار پیس اینڈ سسٹنبل ڈیولپمنٹ کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ آن لائن تعلیم طلبہ کی انفرادی صلاحیت ومہارت کو نہ صرف فروغ دے گی بلکہ 300 سو سالہ قدیم تعلیمی نظام کو بدلنے کے امکانات کی طرف نشان دہی بھی کرے گی۔"

(ویب سائٹ: سی این این بزنس، رائٹر: نیل لیوس، تاریخ 8 اپریل)۔

میں اگر دہلی کے اسکولوں کی بات کروں تو پرائیویٹ سے لے کر سرکاری اسکولوں تک نے آن لائن تعلیم فراہم کرنے کا آغاز کردیا ہے تاکہ اس وائرس کی وجہ سے طلبہ کا تعلیمی نقصان نہ ہو جائے۔ اگر اس بات کا سروے کیا جائے کہ ہفتے میں کسی ایک کلاس میں کتنے گھنٹے کی آن لائن کلاس ہو رہی ہے تو میں اپنے اسکول نیو ہورائزن پبلک اسکول، حضرت نظام الدین اولیا، نئی دہلی کی مثال دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک ہفتے میں ہر کلاس کے اندر تقریباً 18 پیریڈ ہورہے ہیں اور بڑی باقاعدگی کے ساتھ جاری وساری ہیں۔ اسی طرح سے دہلی کے ہزاروں اسکولوں میں آن لائن تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ملک کی کئی ریاستوں نے آن لائن تعلیم کا آغاز کردیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ اپنا ملک ایک نئے تعلیمی نظام کو قبول کرنے کو تیار ہے۔

آج ڈیجیٹل اور آن لائن تعلیم کا سلسلہ جو شروع ہوا ہے اس کے لیے لوگ چند مشہور ومعروف ایپس کا ستعمال کرتے ہیں لیکن بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ Zoom Meeting کے علاوہ بھی کئی ایپ ہیں جو اس وقت آن لائن تعلیم کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ میں مختصر طور پر کچھ ایپس کا تعارف کرانا مناسب سمجھتا ہوں۔

جیسے Zoom Meeting,Cisco Webex Meeting, اور اس طرح کے دوسرے ایپ وغیرہ۔ ان میں سے اکثر و بیشتر ایپ انڈرائڈ اور آئی او ایس دونوں طرح کے موبائل کے لیے ہیں کچھ صرف آئی او ایس کے لیے بھی ہیں۔ جن پر اساتذہ سے لے کر طلبہ تک استفادہ کرسکتے ہیں۔ یہاں پر ان ایپ میں سے کچھ ایپس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

Zoom Cloud Meeting: اس ایپ کا استعمال تقریباً پوری دنیا کے لوگ کررہے ہیں اب تک اس کو دس کروڑ لوگوں نے ڈاؤن لوڈ کرلیا ہے اس ایپ میں چند طرح کی خصوصیات ہیں جیسے اس میں ایک بار میں سو لوگ جڑ کر تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ اس پہ میٹنگ کی مدت مفت میں 30 سے 40 منٹ ہے اگر مدت بڑھانی ہے تو کچھ رقم ادا کرکے بڑھا سکتے ہیں۔ اس میں اسائنمنٹ دینے کا فیچر بھی مقبول ہے۔ اس میں ہر شریک ہونے والے کے ساتھ اسکرین کو شیئر بھی کیا جاسکتا ہے۔ ہاں اس ایپ میں سائبر سیکوریٹی کے کئی مسائل آئے لیکن اس کو حکومت ہند کی گائیڈ لائن سے حل کیا جاچکا ہے لہٰذا اس میں سائبر سیکوریٹی کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس میں میٹنگ کو ریکارڈ بھی کیا جاسکتا ہے۔ تمام شرکا کے جوائن کرنے کے بعد اس کو لاک بھی کیا جاسکتا ہے تاکہ کوئی دوسرا مشکوک شخص نہ آسکے۔ اس لاک ڈاؤن میں یہ ایپ ایجوکیشنسٹ کے علاوہ لوگوں میں بھی مقبول ہے جیسے کئی کمپنیاں اس کا استعمال کررہی ہیں، گھر سے دور دراز

علاقوں میں پھنسے ہوئے افراد ایک دوسرے سے ہم کلامی کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

Cisco Webex Meeting: جب زوم ایپ کی سیکوریٹی کے سلسلے میں شکوک وشبہات آنے لگے تو امریکہ کی ایک بڑی کمپنی نے اپنا ایپ بھی متعارف کروایا جس میں سیکوریٹی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ پڑھنے پڑھانے کی تمام سہولیات کے ساتھ اس کے ذریعے ٹریننگ، ویبی نار، اور دور دراز پھنسے ہوئے لوگوں کو آسانی کے ساتھ امدادی مواد فراہم کرتا ہے اس کے ڈاٹا کو محفوظ رکھنے کی سہولیات بھی موجود ہیں۔ اس ایپ کو بھی اب تک گوگل پلے اسٹور کے مطابق ایک کروڑ سے زیادہ لوگوں نے ڈاؤن لوڈ کرلیا اور استعمال کر رہے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے اگر آن لائن تعلیم کو فروغ دینا ہے تو اس لاک ڈاؤن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کو اس کا عادی بنایا جاسکتا ہے اور اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ بھارت کے ڈیجیٹل تعلیمی پروجیکٹ کو اس وائرس نے مدد پہنچائی ہے بلکہ 'ڈیجیٹل انڈیا' اور 'بھارت پڑھے آن لائن' تحریک کا مقصد پورا ہونے لگا ہے۔ اس وقت پوری دنیا ڈیجیٹل تعلیم کے فروغ کی طرف گامزن ہے۔ اس وائرس نے ڈیجیٹل تعلیمی سلسلے کو ترقی دی ہے اور وہ دن دور نہیں کہ اس کے لئے مزید راستے ہموار ہوں گے۔

■

Manzar Aman
New Horizon Public School
Hazrat Nizamuddin Auliya
Delhi 110013
Mob.: 9618860982

آنولہ

یہ پھل جسے کہتے ہیں سبھی لوگ آنولہ
اور یہ کیا کہا جاتا ہے کسی جا پہ آنولہ
حکما کے لیے دوستو! حکمت ہے آنولہ
اللہ کی اک دین ہے نعمت ہے آنولہ
گرمی کو جگر کی یہ کرے کم اے دوستو
اس چھوٹے سے پھل میں بڑا دم خم ہے دوستو!
کمزور دل کی آنولہ کرتا ہے حفاظت
ہوتی ہے دور اس سے دل و جاں کی نقاہت
دھڑکن کو دل کی رکھے سدا کنٹرول میں
قیمت زیادہ دینی نہیں پڑتی مول میں
پمپلس صاف یہ کرے اور جلد نکھارے
بالوں کو دے بڑھنے میں مدد اور سنوارے
قدرت کا کرشمہ ہے وٹامن 'سی' ہے اس میں
ضامن ہے تندرستی کا اور تُرشی ہے اس میں
آنکھوں کی روشنی کو بڑھاتا ہے آنولہ
اور دل کی تشنگی کو بجھاتا ہے آنولہ
کرتا ہے صاف خون میں انساں کے اضافہ
ہوتا ہے نقاہت میں مریضوں کے افاقہ
دل ہم ضرور فائدہ اس پھل سے اٹھائیں
اور 'بچوں کی دنیا' میں نظم، شائع کرائیں

■

Abdur Razzaq Dil (Kolhapuri)
Dil Bharti House (Qazi Pura)
Kolhapur - 444802
Distt.: Amravati (Maharashtra)

عبدالرحیم نشتر

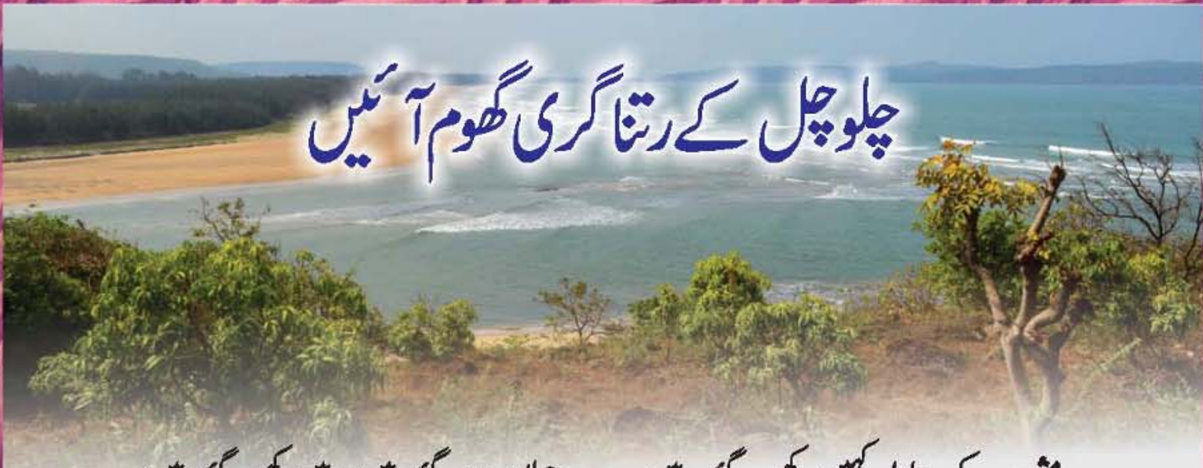

چلو چل کے رتناگری گھوم آئیں

مشیرہ کے دادا کہیں کھو گئے ہیں
جہاں وہ گئے ہیں وہیں کھو گئے ہیں

نکل جاتے ہوں گے سمندر کنارے
لبھاتے ہیں ان کو وہاں کے نظارے

کبھی مفلحہ سیر کرواتی ہوگی
صبح و شام وہ ان کو تھکواتی ہوگی

نہیں تو وہ شیطان عافی کے پیچھے
پہاڑی کے اوپر پہاڑی کے نیچے

لگا تار چڑھتے اترتے تو ہوں گے
ذرا دیر آرام کرتے تو ہوں گے

بڑی ہی سہانی ہیں صبحیں وہاں کی
بڑی ہی سلونی ہیں شامیں وہاں کی

گھنیرے درختوں کی لمبی قطاریں
کہیں رنگارنگ مچھلیوں کی بہاریں

کہیں ناریل اونچی گردن اٹھائے
کہیں پیڑ برگد کا داڑھی ہلائے

کہیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے
کہیں دھوپ سے چھاؤں سہمی ہوئی ہے

وہ موجوں کا اٹھ اٹھ کے ہلڑ مچانا
کبھی تو ابھرنا کبھی ڈوب جانا

یہاں حسنِ فطرت کا عالم نہ پوچھو
یہاں کیسے ہوتے ہیں موسم نہ پوچھو

بڑی روح افزا ہوائیں یہاں کی
فضائیں تو جیسے ہوں جنت نشاں کی

چلو چل کے رتناگری گھوم آئیں
جو دل سے نہ نکلیں وہ یادیں بسائیں

مشیرہ کے دادا بھی اب جو گئے ہیں
گئے ہیں تو جا کر وہیں کھو گئے ہیں

■

Abdur Raheem Nashtar
103, Image Residency, Plot No: 94
Ayyappa Nagar
Nagpur - 440013 (Maharashtra)
Mob.: 7276071869

عبدالمتین جامی

دعوتِ امن

کہا ایک قمری سے اک باز نے
مرے پر ہیں مضبوط کتنے بنے
زمیں سے فلک تک مری ہے اڑان
مجھے یوں ہی آتی نہیں ہے تھکان

ہے پربت کے اوپر بسیرا مرا
مرے سر کے اوپر نہیں آسرا
شکاری ہوں میری ہے دنیا الگ
میں جاں باز ہوں میرا رستہ الگ
میں کھاتا ہوں خود کرکے اپنا شکار
اڑاتا ہوں دہشت کا ہر سو غبار
مگر تو ہے قمری ذرا سی ہے جان
تری حیثیت کیا تری کیا ہے شان
تو شاخِ گلِ تر پہ گاتی ہے گیت
چمن میں تو سب کو بناتی ہے میت
میرا نام سن کر ہی ڈر جائے گی
تو میری ہوا سے ہی مرجائے گی

کہا باز سے سن کے قمری نے سب
تو وحشی ہے وحشی ہی تیرا لقب
پیامِ محبت سناتی ہوں میں
نئی راہِ الفت دکھاتی ہوں میں
میں امن و اماں کی ہوں پیغامبر
تو ڈرنے ڈرانے کی باتیں نہ کر
زمیں والے حیراں بہت ہوچکے
چمن والے ویراں بہت ہوچکے
مرے سُر میں اپنا سُر بھی ملا
میں کمزور ہوں تو بڑھا حوصلہ
زمیں کو ضرورت اخوت کی ہے
بجائے تنفر محبت کی ہے
تو شعر نوائی سے پرہیز کر
اجڑتے گلستاں کو گلریز کر

■

Abdul Matin Jami
Urdu Bazar
PO: Padampur
Distt: Cuttack - 754200 (Odisha)

حارث انصاری برہان پوری

ہمارا اسکول

پیارا ہے اسکول ہمارا ۔۔۔ لگتا ہے جو سات سے بارا
سب سے سندر سب سے نیارا ۔۔۔ منظر اس کا پیارا پیارا
لگتے ہیں یہ کتنے اچھے ۔۔۔ ننھے ننھے پھول سے بچے
دوڑیں بھاگیں دھوم مچائیں ۔۔۔ خوشی خوشی سب پڑھنے آئیں
باتیں ان کی ایسی پیاری ۔۔۔ جیسے چشمۂ آب ہو جاری
اردو ہندی انگلستانی ۔۔۔ ہر بھاشا میں پڑھیں کہانی
باجی شکشک میڈم ٹیچر ۔۔۔ سایۂ شفقت سب کا سر پر
بھاشاؤں کا میل یہاں ہے ۔۔۔ اردو کی تہذیب جواں ہے
نہیں ہے کوئی اصغر و اکبر ۔۔۔ سب ہیں مساوی سب ہیں برابر
ایسا منظر نہیں کہیں پر ۔۔۔ حارث خدا کا شکر ادا کر

■

Haris Ansari Burhanpuri
Ghazi Salar Maidan
Mominpura
Burhanpur - 450331 (MP)

منظور پروانہ

کہانی

سفر ٹوتھ برش کا

بچو! ہر روز صبح صبح آپ منہ اور دانتوں کی صفائی کے ساتھ دانتوں کی شان مسکان برقرار رکھنے کے لیے دانتوں کو چمکدار بنانے کی غرض سے ٹوتھ برش کا استعمال تو کرتے ہی ہوں گے۔ یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ٹوتھ برش سے انسان کا گہرا رشتہ ہے۔ مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ روزانہ استعمال کی دوسری چیزوں کی طرح اب الیکٹرک ٹوتھ برش بھی بازار میں آگیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ابھی ہماری دسترس سے باہر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شکلیں ان کے رنگ تبدیل ہوتے رہے ہیں اور آج ہم مختلف قسم کے ٹوتھ برش کا استعمال کر رہے ہیں۔ جن سے منہ اور دانت کی صفائی بہتر اور محفوظ طریقے سے کی جاتی ہے۔

آج ہم آپ کو ٹوتھ برش کے سفر کا حال بتا رہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب انسان اپنے دانت صاف کرنے کے لیے بانس، نیم یا ببول کی شاخوں کا استعمال کرتا تھا۔ اس کے بعد جانوروں کے بال سے بنے ٹوتھ برش کا زمانہ آیا۔ دور حاضر کی بات کریں تو نائیلون سے بنے ٹوتھ برش زیادہ رواج میں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح ٹوتھ برش کا یہ سفر جانوروں کے بالوں سے ہوتا ہوا نائیلون کے بالوں والے ٹوتھ برش سے گزرتا ہوا الیکٹرک ٹوتھ برش تک پہنچ سکا۔

ایسا مانا جاتا ہے کہ سب سے پہلے 3500 سے 3000 قبل مسیح بے بی لون اور مصر کے رہنے والوں نے ٹوتھ برش کا استعمال کیا تھا۔ وہ لکڑی کے ایک ٹکڑے کے اگلے حصہ کو چبا کر ملائم کر لیتے تھے جس سے دانت صاف کیے جا سکیں۔ مصر کی قدیم قبروں میں لاش کے ساتھ داتون بھی ملے ہیں۔ ویسے اس طرح کی داتونوں کا استعمال آج بھی کئی ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد کچھ لوگ لکڑی کے اگلے حصہ کو ملائم بنانے کے ساتھ ہی پچھلے حصہ کو نوک دار بنانے لگے۔ اس طرح وہ دانتوں کی صفائی کے ساتھ اس برش سے اپنے دانتوں میں پھنسے ہوئے غذا کے ذرات کو بھی نکالنے کا کام لیتے تھے۔

تقریباً 1600 قبل مسیح میں چین میں 'چبانے والی چھڑی' تیار کی گئی۔ جسے خوشبودار درختوں کی شاخوں سے بنایا جاتا تھا۔ اس کے بعد سب سے پہلے ٹوتھ برش کو بنانے کا کام بھی چین

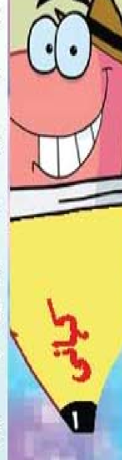

میں ہی ہوا۔ اس ٹوتھ برش کے 'برسل' یعنی جو ٹوتھ برش کا اگلا حصہ ہوتا ہے، میں سور کے بالوں کا استعمال کیا جاتا تھا اور یہ برسل کسی ہڈی یا بانس سے بنے ہینڈل سے جڑا رہتا ہے۔ پھر یہ ٹوتھ برش چین سے یوروپ پہنچا تو وہاں اس میں سور کے بال کے بجائے گھوڑے کے ملائم بال اور پرندوں کے پروں کا استعمال کیا جانے گا۔ سائنس نے جس تیز رفتاری سے ترقی کی، اسی رفتار سے ٹوتھ برش بھی جدید ہوتا گیا۔ زمانہ بدلا تو ٹوتھ برش بھی بدلے۔ آج کے زمانے کے ٹوتھ برش کی کہانی پر نظر ڈالیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کی ایجاد انگلینڈ کے ایک تاجر مین ولیم ایڈیس نے 1780 میں کی۔ اس کی ایجاد کا قصہ بھی کافی دلچسپ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ولیم فساد بھڑکانے کے جرم میں انگلینڈ کی جیل میں بند تھا۔ اس نے ایک دن اپنے کھانے میں نکلی ایک ہڈی کو لیا اور اس میں سوراخ کر کے جانوروں کے بالوں کو چپکا کر اپنے لیے دانتوں کا برش تیار کر لیا اور جب وہ جیل سے رہا ہوا تو اس نے اپنے تاجرانہ ذہن کی بدولت اسی طرح کے ٹوتھ برش بنا کر فروخت کرنا شروع کر دیے اور اپنی ایک کمپنی بھی شروع کی۔ ولیم ایڈیس نے بھلے ہی اس کو بنایا ہو مگر پیٹنٹ کے معاملے میں امریکہ نے بازی مار لی۔ 7 نومبر 1957 کو امریکا کے ایچ، این، واسورتھ نے ٹوتھ برش پیٹنٹ حاصل کیا۔ 1844 سے پہلے تین لائن والے برسل برش کی ایجاد ہوئی۔

پہلی عالمی جنگ کے دوران سیلولائڈ پلاسٹک سے بنا ہینڈل سامنے آیا۔ اس وقت ہڈیوں کا استعمال چونکہ صابن بنانے کے لئے ہونے لگا تھا، اس لیے برش کے ہینڈل کے لیے ہڈیوں کی کمی پڑ گئی تھی۔ نائیلون کی ایجاد کے بعد برش میں جانوروں کے بال کی جگہ نائلون نے لے لی۔ 1938 میں پہلی بار جانوروں کے بالوں کو استعمال میں لا کر ٹوتھ برش تیار کیا گیا۔ آج زیادہ تر لوگ اسی ٹوتھ برش کا استعمال کر رہے ہیں۔

اب بازار میں الیکٹرک ٹوتھ برش بھی آ گیا ہے۔ پہلا الکٹرک ٹوتھ برش 1931 میں بنایا گیا۔ 1960 میں امریکہ کا پہلا الکٹرک ٹوتھ برش 'بروکسوڈینٹ' تھا۔ ٹوتھ برش کا یہ سفر جاری ہے۔ دیکھئے آگے اور کیسے کیسے ٹوتھ برش بازار میں آتے ہیں۔

■

ManzoorParwana
Chicken Shopi
Nazeerabad
Lucknow - 226018 (UP)

جوابات

(13) بھیڑوں کا ریوڑ

ڈ	ذ	ر	ڑ	ز	ژ
لڈو	ذکر	مرضی	کپڑا	میز	ژال
ڈال	لذیذ	جرم	گڑبڑ	عزیز	ژرف
گنڈا	لذت	برا	جڑ	مزاج	ژالہ
جھنڈ	عذاب	بھاری	کڑوا	عزت	
	ذرہ	ورق	گڑیا		
		شریر			
		کرم			

■

مآخذ: اردو زبان کا جادو (پارٹ 1)، ادارہ، سنہ اشاعت: تیسری طباعت 2009، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ملک بزمی

مہربان چاچا

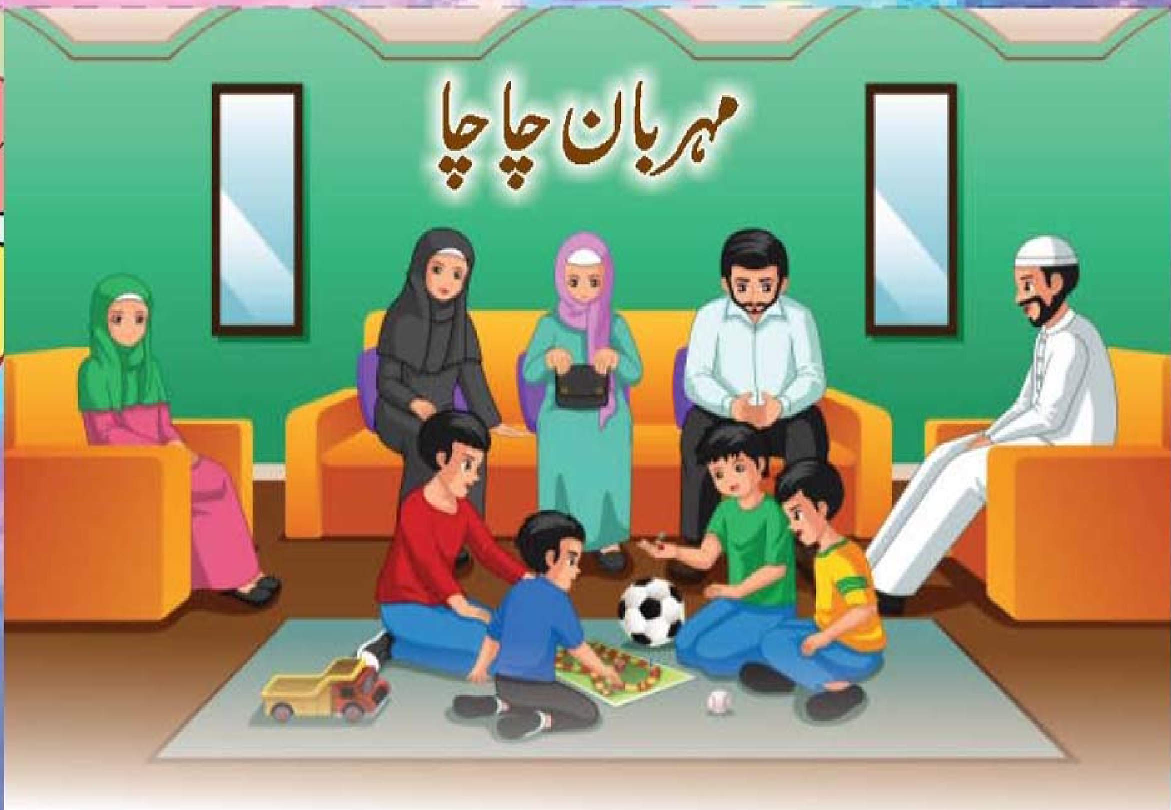

24 دسمبر 2017 کو میری پوتی طہورا شادانی کی ساتویں سالگرہ تھی۔ اس کی ضد تھی کہ دادا اور دادی بھی اس کی سالگرہ کی خوشیوں میں شریک ہوں۔ چنانچہ میرے بیٹے اور بہو نے موبائل پر ہم دونوں کو آنے کے لیے کہا تھا اور اسی فون پر اپنی ممی کے بعد طہورا شادانی نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ ''دادا حضرت آپ کو آنا ہی ہوگا۔ دادی جان آپ بھی اپنی طہورا کے لیے آئیں گی نا'' اس کے فوری بعد اثاثہ مہک نے اپنی چھوٹی بہن کی سالگرہ پارٹی کے لیے دعوت دینا اپنا فرض سمجھا۔ اور ان کے ساتھ ساتھ ہمارے پوتے نے بھی شرکت کے لیے دھمکی دے ڈالی۔ شاذ کی اس پیار بھری دھمکی کے بعد تو ہمیں جانا ہی تھا۔ ہم جیسے ہی پہنچے پورا گھر خوشیوں سے جھوم اٹھا۔ طہورا کی ہم جولیوں سے سماں بندھ گیا۔ اثاثہ مہک اور شاذ کے دوستوں نے وہ دھوم مچائی کہ بس مزہ آ گیا۔ رات گیارہ بجے تک طہورا کو گفٹ دیے گئے۔ چاکلیٹ اور شاندار کیک نے اس محفل کو گل و گلزار بنا ڈالا۔ دوسرے دن 25 دسمبر کو کرسمس کی تعطیل بھی تھی، اس لیے جلد اٹھنے اور اسکول جانے کا بھی سوال نہیں تھا۔ قسم قسم کی ڈشیں موجود تھیں۔ سب بچوں نے بھی خوب مزہ لوٹا اور جب گیارہ بجے، سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے اور ہم نے سونا چاہا تو طہورا، اثاثہ، ناصحہ اور شاذ نے ایک محاذ کھول دیا۔ فرمائش کی کہ میں انھیں دلچسپ قصے اور کہانیاں سناؤں۔

آج کے اس خوبصورت فنکشن کے بعد میں ان بچوں کو

ناراض کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنی بہو سے کہا دیکھو بہو! اچھی چائے بنالاؤ سب کے لیے اور ہم اطمینان سے اپنے بستر پر بیٹھیں گے اور چائے پینے کے بعد میں اپنی زندگی کا وہ واقعہ سناؤں گا جسے سن کر آپ سب نہ صرف خوش ہو جائیں گے بلکہ اس سے سبق بھی حاصل کریں گے۔ شرط یہ ہے کہ آپ سب نہایت خاموشی سے میری بات سنیں۔ طہورا، ناصحہ، اثاثہ، شاذ کے ساتھ ساتھ میرے بیٹے، بہو حتیٰ کہ میری اہلیہ نے بھی وعدہ کرلیا کہ وہ نہایت سکون سے واقعہ سنیں گے۔ شاذ نے دو گاؤ تکیے میرے بستر کے ساتھ لگا دیے اور اثاثہ نے پانی کا جگ اور گلاس ٹیبل پر لگا دیے۔ چائے پینے کے بعد میں نے اپنی بات اس طرح شروع کی۔

وہ میری ملازمت کا پہلا دن تھا 15 جنوری 1959 یعنی آج سے ٹھیک انسٹھ برس پہلے یلدری ڈیم پر میں رجوع ہوا تھا۔ اسے یلدری کیمپ کہا جاتا تھا۔ ہمہ اقسام کی مشنری میں نے وہاں دیکھی اور مختلف ریاستوں کے لوگ وہاں برسرکار تھے۔ سب ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔

میرا انٹرویو دسمبر 1958 کے دوسرے ہفتے میں ہوا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے شہر پربھنی سے میرے ہم عمر دو نوجوان احسن اور نور الحسن وہاں ملازم تھے۔ 15 جنوری کو جب میں وہاں گیا تو ان دونوں کو بھی خوشی ہوئی اور ہم تینوں کا ایک گروپ بن گیا۔ ہم تینوں ہی الگ الگ دفتروں میں کام کرتے تھے۔ دن میں ملاقات تو نہیں ہوتی تھی لیکن دفتری اوقات کے بعد ہم ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے۔ دوسرے ہی روز مجھے پتہ چلا کہ یہاں 26 جنوری اور 15 اگست کو کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ سکریٹری صاحب نے جب مجھ سے دریافت کیا کہ میں کون کون سے کھیل کھیلتا ہوں تو میں نے بتایا کہ ہاکی، فٹ بال اور والی بال کے علاوہ کیرم بھی کھیلتا ہوں۔ اس پر وہ بولے ”خان صاحب فٹ بال اور ہاکی کے لیے یہاں میدان ہیں نا اتنے پلیئرز۔ ہاں والی بال۔ بیڈمنٹن، کیرم، شطرنج وغیرہ کھیلے جاتے ہیں۔ ہر گیم کے لیے ایک روپیہ فیس ہوتی ہے۔ شطرنج تو میں نہیں کھیلتا تھا۔ البتہ والی بال بیڈمنٹن اور کیرم میں میں نے نہ صرف حصہ لیا بلکہ سبھی میں پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل کی۔ آفیسرز بھی میرے کھیل سے بہت متاثر ہوئے اور ایک ہفتہ ہی میں مجھے سب پہچاننے لگے۔ اس وقت میری تنخواہ صرف ایک سو روپیہ تھی۔ یکم فروری 1959 کو اپنی پہلی تنخواہ لینے کے لیے میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہیڈ کلرک جناب بھیکا جی راؤ صاحب کے پاس پہنچا۔ اس وقت بال پین کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ نب والے پین ہوتے تھے جن میں سیاہی بھری ہوتی تھی۔ میرے آگے موہن دیشپانڈے تھے اور ان کے آگے بھی چار پانچ لوگ اور تھے۔ میں نے دیکھا آگے والا شخص ادب و احترام کے ساتھ ہیڈ کلرک بھیکا جی راؤ صاحب کو سلام پیش کرتا پھر پے رول (Pay Roll) پر دستخط کرتا۔ بھیکا راؤ جی کے دائیں بائیں دو اور کلرک ان کی مدد کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ بھیکا جی راؤ صاحب رقم نکال کر پہلے خود گنتے، پھر کلرک کو دیتے وہ بھی رقم گنتا۔ تب متعلقہ شخص کو رقم دی جاتی۔ وہ رقم لے کر مطمئن ہو جاتا اور جانے سے قبل ایک بار پھر تعظیماً جھک کر سلام کرتا۔ اس کے بعد دوسرا شخص بھی یہی عمل دہراتا۔ میں دلچسپی اور غور سے یہ سب اس لیے بھی دیکھ رہا تھا کہ میری اپنی باری آنے پر مجھے بھی ایسا ہی عمل کرنا ہوگا۔ دس پندرہ منٹ بعد میرا نمبر بھی

آ گیا۔ میں نے بھی ہیڈ کلرک کو جھک کر سلام کیا اور پین نکال کر پے رول پر دستخط کرنا ہی چاہتا تھا کہ ہیڈ کلرک صاحب نے روک دیا اور کہا ”خان صاحب! میری ایک بات سن لیجیے۔ آپ دستخط کریں گے لیکن میں آپ کو رقم نہیں دوں گا۔ آپ اپنی رقم لینے کے لیے رات سات بجے کے بعد میرے گھر آئیں، وہاں میں آپ کو اپنی تنخواہ دے دوں گا۔ اگر آپ کو میری یہ بات منظور نہ ہو تو آپ دستخط نہ کریں۔“ میں نے ان سے کوئی سوال ہی نہیں کیا اور کہا ”سر میں آپ کے گھر پر سات بجے ضرور آؤں گا۔“ اور پھر انھیں سلام کرتے ہوئے دستخط کر دیے اور چلا آیا۔ دفتری اوقات کے بعد نور الحسن سے ملاقات ہونے پر انھیں بتایا کہ ہیڈ کلرک صاحب نے تنخواہ لینے کے لیے سات بجے گھر پر بلایا ہے۔ شام کا کھانا کھا کر میں سات بجے ہیڈ کلرک صاحب کے گھر گیا۔ زنجیر بجائی ان کا بیٹا گنیش آیا۔ میں نے کہا ہیڈ کلرک صاحب نے بلایا ہے۔ وہ اطلاع دینے گیا اور فوری واپس آ کر مجھے بیٹھنے کے لیے کہا تب ہی ہیڈ کلرک صاحب آ گئے۔ انھیں دیکھ کر میں اٹھا۔ ادب سے انھیں سلام کیا۔

بیٹھیے خان صاحب اور یہ بتائیے کہ آپ چائے پینا پسند کریں گے یا کافی؟“ میں بولا۔

شکریہ صاحب! ابھی ابھی چائے پی کر چلا ہوں۔ اب ضرورت نہیں“ میرا جواب سن کر وہ بولے:

”نہیں میاں سردی کا موسم ہے اور آپ پہلی بار میرے

گھر آئے ہیں۔ آپ بس یہ فرمائیں کہ چائے چلے گی یا کافی؟" اس بار میرا جواب پھر انکار میں تھا۔ "نہیں سر، آپ کا بہت شکریہ۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔! ہیڈ کلرک صاحب اپنے بیٹے گنیش سے کہنے لگے "گنیش اپنی ماں سے کہو، دو کپ چائے بنا کر دے۔ گنیش چلا گیا تب مجھ سے کہا "خان صاحب آپ نے میری بات رکھ لی۔ بیٹے مجھے آپ کی یہ انکساری بہت اچھی لگی۔ آپ نے کوئی سوال جواب نہیں کیا، کوئی حجت نہیں کی۔ اگر آپ ذرا بھی ناراضگی دکھاتے اور کہتے کہ میری تنخواہ ابھی دو تو یقین مانو میں آپ کی تنخواہ فوراً دے دیتا لیکن آپ نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ مجھے آپ کی یہ سعادت مندی بہت اچھی لگی۔ بھلا بتاؤ تو میں نے اس وقت آپ کو تنخواہ کیوں نہیں دی؟ اور گھر آکر تنخواہ لینے کی بات کیوں کہی؟"

"سر مجھے کیا پتہ۔ آپ نے کہا سات بجے گھر آکر تنخواہ لینا اور میں نے آپ کی ہدایت مان لی۔" حجت کرنے کا کوئی سوال ہی کہاں، اتنے میں گنیش نے ایک ٹرے میں پانی کے گلاس اور دو کپ چائے ہمیں پیش کی۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا کپ لیا۔ چائے پیتے ہوئے ہیڈ کلرک صاحب پھر کہنے لگے "میاں آج کے نوجوان آپ کی طرح سعادت مند نہیں ہیں۔ آپ نے ذرا سی بھی ناراضگی نہیں جتائی۔ اس کے لیے بہت شکریہ۔" اسی وقت گنیش کی والدہ بھی چلی آئیں۔ انھیں دیکھ کر میں کرسی سے اٹھ گیا اور سلام کیا۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور کہا "جگ جگ جیو بیٹا" اور خود بھی وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ہیڈ کلرک سے میں نے کہا "سر، کیسا شکریہ۔ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں آپ کے بیٹے گنیش کی طرح آپ کا بیٹا ہی تو ہوں۔ میں آپ کی بات کیسے ٹال دیتا؟"

"دیکھا لکشمی! اس نوجوان نے آج میری لاج رکھ لی۔ دفتر میں یہ ذرا اونچی آواز میں بھی اگر کچھ کہہ دیتا تو میری عزت تو خاک میں مل جاتی۔ میں اس کی تنخواہ بھی وہیں دے دیتا اور اب یہ مجھ سے شکریہ کا لفظ بھی سننے کا روادار نہیں۔ نہیں بیٹے آپ عظیم ہیں۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔ آپ گنیش اور لکشمی سے بات کرو۔ میں رقم لے کر آتا ہوں۔" اور وہ میری تنخواہ کی رقم جو پچاس روپیہ تھی۔ دس دس کے دو نوٹ، پانچ پانچ کے چار نوٹ اور باقی دو دو اور ایک ایک کے نوٹ پر مشتمل تھی، لے کر آئے اور مجھے دینے سے پہلے ایک بار اور پوچھا کہ میں نے آفس میں تنخواہ کیوں نہیں دی؟" میں نے کہا سر میں کیسے جان سکتا ہوں؟ آپ ہی بتلا دیں۔" کہنے لگے "لکشمی، خان صاحب یہاں اکیلے رہتے ہیں۔ ہمارے زمانے کا یہ اصول تھا کہ جب بھی کوئی شخص ملازم ہو جاتا اور اسے پہلی بار جو تنخواہ ملتی تو وہ اس رقم کو اپنے گھر لے جاتا اور گھر میں جو سب سے عمر رسیدہ شخص ہوتا، چاہے اس کا دادا، یا نانا، تو وہ اپنی پوری تنخواہ ان کے ہاتھوں میں پورے ادب و احترام کے ساتھ پیش کرتا اور وہ شخص جو اس کا دادا یا نانا ہوتا اس کو اپنے سینے سے لگاتا، اس کی پیشانی چومتا۔ اسے مبارک باد دیتا اور اسے نصیحت کرتا کہ بیٹے یہ تمھاری محنت اور ایمانداری کی پاک کمائی ہے۔ اسے فضول خرچی میں خراب کاموں میں خرچ نہیں کرنا، ضائع نہیں کرنا۔ میاں! میں جانتا تھا۔ یہاں آپ اکیلے ہیں۔ یہ پہلی کمائی آپ کس کے سپرد کریں گے۔ نہ دادا ہے نہ نانا ہے۔ کون آپ کو سینے سے لگا کر پیار کرے گا؟ کون آپ کو مبارکباد دے گا؟ کون آپ کو نصیحت کرے گا تو میں نے سوچا کہ یہ فرض میں خود

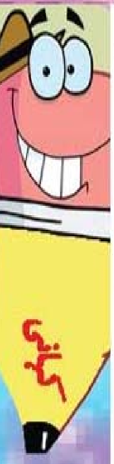

ہی ادا کروں گا۔ آپ مجھے اپنا دادا۔ نانا یا چاچا کچھ بھی تصور کریں۔ بس اس لیے یہ رقم آفس میں نہیں دے سکا کہ اتنی ساری باتیں وہاں کہنے کا موقع تھا نہ محل اور پھر کئی لوگ اپنی اپنی تنخواہیں لینے کے لیے قطار میں موجود تھے۔ بس میاں یہ بات تھی۔ آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ میرے سر پر اپنے ہاتھ پھیرے اور کہا" بیٹے یہ حق حلال کی کمائی ہے۔ مجھے امید ہے آپ میری باتوں پر عمل کروگے اور اس رقم کو اچھے کامو ں میں لگاؤ گے۔" اتنا کہہ کر رقم میرے ہاتھوں میں دے دی۔ میں نے ایک بار پھر ادب سے انھیں عقیدت بھرا سلام کیا اور ان کی اہلیہ کو بھی سلام کیا۔ انھوں نے بھی مبارکباد دی اور دعائیں بھی۔

میں ان کے جذبات اور محبت سے اس درجے متاثر ہوا کہ میری آنکھیں بھر آئیں اور میں نے پورے ادب واحترام سے اپنی تنخواہ کی پوری رقم دوبارہ انھیں سونپ دی۔" ارے بھائی یہ کیا کر رہے ہو۔ اب تو میں نے آپ کو مبارکباد بھی دے دی اور نصیحت بھی کردی پھر یہ رقم لے کر کیوں نہیں جارہے ہو؟" ہیڈ کلرک صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ جواب میں میں نے کہا" سر! اگر یہ رقم میں اپنے دادا، نانا، یا چاچا۔ والد کے ہاتھوں میں دیتا تو کیا مبارکباد اور نصیحت کے فوری بعد لے کر چلا جاتا؟ نہیں سر۔ آج یہ تنخواہ کی رقم میرے چاچا یعنی آپ کے پاس ہی رہے گی۔ کل شام سات بجے میں پھر آپ کے گھر آؤں گا اور اپنی رقم لے کر جاؤں گا۔" میری اس بات کو سن کر ہیڈ کلرک صاحب نے بے ساختہ مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ اپنی خوشی اور محبت کا اظہار انھوں نے رقم قبول کرتے ہوئے ان الفاظ میں کیا" بیٹے واقعی تمھارا انداز لاجواب ہے۔ میری دعائیں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہیں گی۔ آپ اپنے والدین کا ہمیشہ ادب کریں، ان کا خیال رکھیں۔ آپ کئی لوگوں کے لیے مثال بنیں۔ یہی میری تمنا اور آرزو ہے۔" میں نے انھیں سلام کیا اور ان کی اہلیہ کو بھی اور گنیش کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر اپنے گھر چلا آیا۔ دوسری شام سات بجے ہیڈ کلرک صاحب کے گھر پہنچا تو وہ میرا انتظار ہی کر رہے تھے۔ میں نے سلام کیا تو اپنی اہلیہ سے کہنے لگے۔" دیکھا لکشمی یہ وقت کی پابندی بھی کس طرح کرتے ہیں؟" اس روز پھر زبردستی چائے پلائی اور میری رقم میرے حوالے کی۔ طہورا، ناصحہ، اور اثاثہ یہ واقعہ سن کر بہت متاثر اور خوش ہوئے۔ میری بہو بھی خوش تھی۔ شاذ نے دادی سے پوچھا۔" دادی جان آپ کو یہ پتہ تھا؟ دادی نے جواب دیا اسے سن کر سبھی نے خوب مزہ لیا۔" ارے شاذ بیٹے۔ یہ قصہ تو میں پچاس بار سن چکی ہوں۔ تمھارے دادا جی نے بتایا تھا کہ وہ ہماری شادی میں بھی شریک ہوئے تھے او رجب میں پہلی بار ریلدری کیمپ آئی تھی تو مجھے چاچا جی کے گھر بھی لے کر گئے تھے۔ میں نے بھی چاچا جی اور چاچی جی کو جب سلام کیا تو انھوں نے محبت سے مجھے ایک خوبصورت شال بھی دی تھی۔ ارے بہو وہی شال جسے تم اور بچے کئی بار دیکھ چکے ہو اور میں جسے خاص خاص موقعوں پر ہی استعمال کرتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں چاچا جی اور چاچی نے ہمیشہ اسی طرح میرا خیال رکھا جیسے ماں باپ اپنی بیٹی کا خیال رکھتے ہیں!!

■

Malik Bazmi C/o Shafi Ahmed Shafi
Opp: Metro Foot Wear Bhoi Galli
Po, Distt: Parbhani - 431401 (MS)

سلیم خان

محبت کا نرالا انداز

ماں باپ اپنے بچوں سے بے حد محبت کرتے ہیں اور ان کے روشن مستقبل کے لیے بڑی ذمے داری سے ان کی تربیت کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی ان کی تربیت کا انداز ایسا نرالا ہوتا ہے کہ اسے بچے تو کیا بڑے بھی سمجھ نہیں پاتے۔ محبت کے ایسے ہی نرالے انداز کی یہ ایک کہانی ہے۔

میری ملازمت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میں اپنے ابّو کی نصیحت کے مطابق سینئر ٹیچرس کی صحبت میں رہا کرتا تھا۔ اپنی خوش کلامی اور اِخلاص کی بنا پر بہت جلد میں اسٹاف کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مجھے عادل صاحب کی قربت حاصل تھی۔ وہ مجھے چھوٹے بھائی کی طرح چاہنے لگے تھے۔ عادل صاحب بڑے قابل، جہاں دیدہ اور وضع دار شخص تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سب ساتھی انھیں عادل سر کے بجائے عادل صاحب کہا کرتے تھے۔ انھیں زبان وادب اور فنونِ لطیفہ سے خاص لگاؤ تھا۔ مجھے بھی ادب سے شغف اور مطالعے کا شوق تھا اور یہی ذوق وشوق ہمارے میل جول کی بنیاد ثابت ہوا تھا۔

چھٹی کے بعد ہم شام کو تفریح کے لیے ساتھ جایا کرتے، جب وہ بازار جاتے تو اکثر مجھے ساتھ لے جاتے اور اس طرح مجھے ان سے مول تول کے گُر بھی سیکھنے کا موقع مل جایا کرتا۔ میری جستجو اور لگن دیکھ کر وہ بڑی اپنائیت سے میری رہنمائی کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے، ”جن میں سیکھنے کا جذبہ ہوتا ہے، وہی لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔“

عادل صاحب بڑے باذوق، ہرفن مولا آدمی تھے۔ کبھی وہ گیت اور کبھی غزلیں سناتے۔ جب فرصت میں ہوتے پیانو یا بینجو بجایا کرتے۔ اور جو بات ان کے دل میں سما جاتی اسے چیلنج سمجھ کر پورا کیا کرتے۔ ایک مرتبہ بازار میں بانسری بیچنے والا دکھائی دیا۔ اسے روک کر کہا، ”بھائی بانسری بیچ رہے ہو، مگر بجانی آتی ہے یا نہیں؟“

”جی صاحب، یہ تو ہمارا آبائی پیشہ ہے۔“

”تو پھر کسی پرانی فلم کے گیت کا مکھڑا سنا دو۔!“

بانسری والے نے فلم ’گیت‘ کا گیت، ’آجا تجھ کو پکارے...‘ ایسے سنایا کے عادل صاحب جھوم اُٹھے اور انھوں نے فوراً پچاس کا نوٹ دے کر بانسری خرید لی۔ بانسری فروش نے جب انھیں باقی پیسے واپس کرنا چاہے، تو اس کا شانہ تھپ تھپا کر بولے، ”ارے بھائی رہنے دو۔ اس کی قیمت تم کیا جانو، یہ دل والوں کا ساز ہے۔“ اور پھر چند ہی روز میں وہ بانسری بجانا بھی سیکھ گئے تھے۔ عادل صاحب کی فیاضی، قابلیت اور ذوق وشوق کے بارے میں ہم کافی جان چکے۔ آیئے اب ان کی محبت کے انوکھے انداز کی بات کریں۔

ایک روز چھٹی کے بعد عادل صاحب نے مجھ سے کہا، ”اگر کچھ کام نہ ہو تو آج گھومنے کے لیے تالاب کی طرف چلتے ہیں۔“

”جی سر، میں بالکل فری ہوں۔“

”لیکن ہم پہلے گھر چلیں گے، کم از کم دو بیڑے ساتھ رکھنا ہوں گے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ پان کھائے بنا ہماری تفریح نہیں ہوتی۔“

”جی سر۔!“ میں نے مسکرا کر ہامی بھری۔

ہم گھر پہنچے۔ میں نے ان کی بیوی کو سلام عرض کیا۔ انھوں نے جواب دے کر مجھ سے خیریت پوچھی۔ ان کی فیملی مجھ سے مانوس تھی، سو میں بلا تکلف ہال میں بچھے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ عادل صاحب اپنا پاندان اٹھا لائے اور میرے قریب بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتے ہوئے پان بنانے لگے۔ اسی اثنا میں ان کی گیارہ بارہ سالہ بیٹی شبانہ ہمارے لیے پانی لے آئی۔ ”السلام علیکم!“ بچی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا اور اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ مگر عادل صاحب اس کی جانب دیکھے بغیر بدستور پان بناتے رہے۔ شبانہ ہمارے سامنے سر پہ دوپٹا اوڑھے ادب سے خاموش کھڑی رہی۔ عادل صاحب کی بیگم بھی چائے بناتے ہوئے چپ چاپ یہ منظر دیکھتی رہی۔ شبانہ کے اس طرح کھڑے رہنے سے مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ میں نے دبی آواز میں کہا، ”سر پانی لے لیجیے۔“ مگر عادل صاحب متوجہ نہ ہوئے۔ اور آخر انھوں نے اپنا کام ختم کرنے کے بعد ہی بچی کے ہاتھ سے گلاس لیا۔ اس کے بعد وہ ہمارے لیے چائے لائی اور چائے پی کر ہم لوگ گھر سے نکل پڑے۔

دین و دنیا کی باتیں کرتے ہوئے ہم تالاب کے قریب پہنچے اور ایک ٹیلے نما چٹان پر بیٹھ گئے۔ ڈوبتا سورج مغربی افق پر سرخی بکھیر رہا تھا۔ ہلکے سنہری بادل رفتہ رفتہ سُرمئی ہوتے جا رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پُرکیف ہوائیں چل رہی تھیں۔ پرندے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ تھکے ماندے چوپائے تالاب پر اپنی پیاس بجھاتے ہوئے گھر جا رہے تھے۔ ایسے دلکش ماحول میں عادل

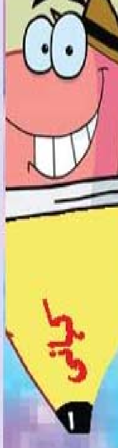

صاحب مجھ پر اپنے تجربات کے گوہر لٹا رہے تھے اور میں انھیں پوری توجہ سے سمیٹ رہا تھا۔ مگر بار بار میرے ذہن میں پانی لے کر ادب سے خاموش کھڑی ہوئی شبانہ کا منظر گھوم رہا تھا۔ 'عادل صاحب ایسے نرم دل، مہذب آدمی اور اپنی بیٹی کے ساتھ اتنا سخت رویہ۔!!؟' یہ سوچ کر مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔

جب ہم گاؤں کی طرف واپس ہوئے تو مجھے گم صم دیکھ کر انھوں نے پوچھا، ''کیا بات ہے، آپ کچھ کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہیں۔؟'

''جی سر، معذرت کے ساتھ ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''ارے بھائی معذرت کیوں، جو پوچھنا ہے بلا تکلف پوچھیے، آپ کو اجازت ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کے سوال سے میرے ذہن میں کوئی نئی بات ابھر آئے۔''

''نہیں سر، یہ تو آپ کا بڑا پن ہے۔''

''خیر، تو پوچھیے کیا بات ہے۔؟''

میں نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا، ''سر شبانہ بیٹی آپ کے سامنے پانی لے کر کھڑی رہی مگر...!؟''

''مگر آپ نے کافی دیر بعد پانی لیا۔' عادل صاحب نے تیزی سے میرا جملہ مکمل کر دیا۔

''ہاں سر، آپ کا یہ رویہ مجھے بڑا عجیب سا لگا۔''

''عجیب سا نہیں بلکہ آپ کو میرا یہ سلوک ناگوار گزرا ہوگا۔'' مگر میرا یہ برتاؤ شبانہ کے حق میں باعثِ راحت ہے۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا، ''یعنی آپ نے یہ سب جان بوجھ کر کیا تھا۔

''جی بالکل۔!''

سر، یہ بات میں سمجھا نہیں۔!!''

''میاں، یہ بات تو ایک دور اندیش، حساس باپ ہی سمجھ سکتا ہے۔''

''مطلب۔!؟''

''مطلب یہ کہ بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے، شادی کے بعد اسے سسرال میں خانہ داری کے علاوہ دیگر فرائض انجام دینا ہوتے ہیں۔ نہ جانے شبانہ کو کیسے مزاج کے لوگوں سے پالا پڑے۔ کیسا ماحول نصیب ہو۔ اس لیے میں اسے صبر و تحمل اور حُسنِ اخلاق جیسی خوبیوں سے آراستہ کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اگر سسرال میں اس کے ساتھ کوئی سختی سے پیش آئے تو اسے تکلیف نہ ہو، وہ بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے محبت کرے۔ آپ نے جو دیکھا وہ اسی تربیت کی ایک جھلک تھی۔ اس معاملے میں شبانہ کی امی بھی میرے ساتھ ہے۔ لیکن ہم اس تربیت کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات واحساسات کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

عادل صاحب کی بصیرت افروز باتیں سن کر میں حیران رہ گیا، اور سوچنے لگا، ''ماں باپ کتنی ذمہ داری سے اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں اور ان کی خوشحال کامیاب زندگی کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ ان کی محبت کے انداز کتنے نرالے ہوتے ہیں۔

■

Saleem Khan Ismail Khan
Millat Nagar Faizpur
Distt:Jalgaon- 425503(M.S)

محمد قیوم میو

فرشتہ صفت

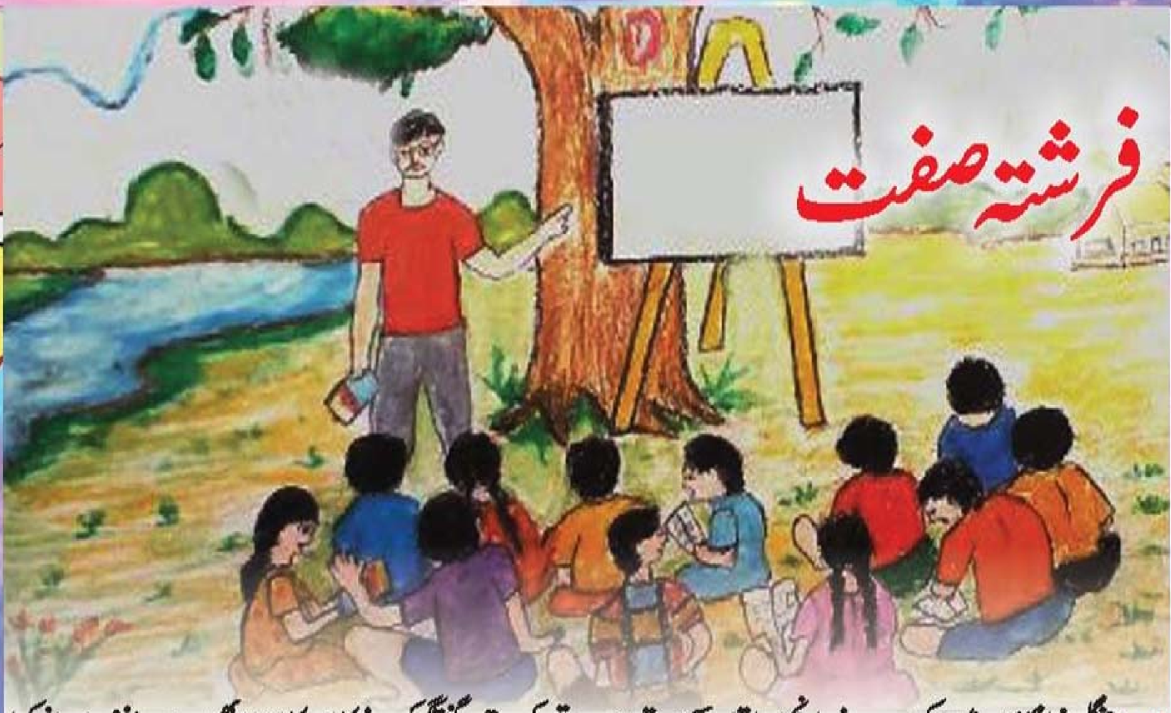

اس جنگل نما گاؤں میں حکومت نے پانچ اساتذہ بھیجے تھے جو وہاں جا کر بچوں کو تعلیم دے سکیں۔ اتفاق سے ان اساتذہ میں میرا بھی شمار تھا۔ میرے ساتھیوں میں بحیثیت اردو ٹیچر شان محمد بھی تھے جو بے حد خوش مزاج اور ملنسار واقع ہوئے تھے۔ میں اس گاؤں میں آیا تو عجیب ماحول ملا۔ جیسے میں قید و بند میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ مجھے بڑی کوفت ہوئی لیکن پھر رفتہ رفتہ میں نے ماحول سے سمجھوتہ کر لیا اور اسی رنگ میں رچ بس گیا لیکن جب میں یہاں کے مخلص و ہمدرد لوگوں سے ملا تو دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اس گاؤں کی نصف آبادی غریبوں اور محنت کشوں کی تھی لیکن اس کے باوجود بڑے ہی فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ میں ان ٹیچروں میں سب سے زیادہ شان محمد صاحب سے متاثر ہوا تھا۔ بے حد سنجیدہ اور کم بولنے والے انسان تھے۔ عمر یہی کوئی تیس بتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا اور لباس بڑے ہی نفاست سے زیب تن کرتے۔ گفتگو کرنے کا ان کا انداز بھی بے حد منفرد اور انوکھا تھا۔ ہر بات اچھی طرح سمجھاتے۔ شروع شروع میں تو خود میں بھی ان سے گفتگو کرنے میں ہچکچایا کرتا تھا لیکن پھر بعد میں ان کے طور طریقوں سے واقف ہو گیا۔ پھر ہم دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ عمر کے لحاظ سے وہ مجھ سے کافی بڑے تھے۔ اس لیے میں احترام سے 'سر' کہا کرتا اور وہ مجھ سے کئی بار کہہ چکے تھے۔ ''ارے بھائی قیوم صاحب مجھے سر کہہ کر شرمندہ مت کیا کرو۔ ہم تو ہم عمر ہیں۔ ہم خیال ہیں۔ پھر یہ سرور کا نعرہ کیوں بلند کرتے ہو؟''

میں ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتا جب کہ گاؤں کے بڑے بوڑھے بچے جوان سبھی انھیں ماسٹر جی کہہ کر مخاطب کیا کرتے۔ ہمارے رہنے کا انتظام اسکول ہی میں کیا گیا تھا جہاں ہم رات کو آرام کرتے اور دن میں بچوں کو تعلیم دیتے اور سب ایک ساتھ ہی رات کو کھانا بناتے۔

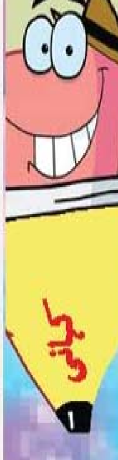

سالن کے لیے روزانہ ہم سر کو مجبور کرتے کیونکہ وہ ایسا مزے دار سالن پکاتے کہ جو بھی کھائے انگلیاں چاٹتا رہ جائے اور وہ کبھی انکار بھی نہیں کرتے۔ باقی سب اپنا اپنا کام کرتے کوئی آٹا گوندھتا تو کوئی چولھا پھونکتا، کوئی مصالحہ پیستا۔ واقعی اتنا مزہ آتا جب سب بیٹھ کر ایک دسترخوان پر کھاتے، بیان نہیں کرسکتے اور پھر رات گئے تک باتیں کرتے، کوئی لطیفہ سناتا تو کوئی سیاست پر تبصرہ کرتا۔ میں اب تک شہر میں رہ کر خود کو بڑا بدقسمت تصور کرتا تھا۔ اسی گاؤں کی آب و ہوا بھی میرے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی تھی۔ ہر سو ہریالی اور سرسبز و شاداب کھیت ہی کھیت نظر آتے اور گاؤں کی الھڑ دوشیزائیں کنوئیں سے پانی کھینچتی ہوئی نظر آتیں اور ان کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر دل خوشی سے جھوم جھوم اٹھتا اور میں سوچنے پر مجبور ہوجاتا کہ دیکھو یہ مفلس و نادار ہو کر بھی کتنے خوش و خرم ہیں اور شہر کی وہ لڑکیاں ہیں جن کے چہرے سے جیسے ہنسی نوچ لی گئی ہو۔ ہنسنے مسکرانے کا حق ان سے چھین لیا گیا ہو جیسے وہ اس کی مستحق ہی نہ ہوں۔

ہفتے کا بازار گاؤں میں لگتا تھا۔ جب ہم اپنی ضروریات کی اشیا خرید لیتے اور پھر ہفتے بھر تک مزے سے کھاتے رہتے۔ میں اپنی بیوی کو اس لیے اپنے ساتھ گاؤں نہیں لایا تھا کہ وہ اس گاؤں کے ہیبت ناک ماحول کو قبول کرے گی بھی یا نہیں کیونکہ وہ شہر کی رہنے والی ہیں۔ بھلا انھیں گاؤں میں کیا اچھا لگے گا، ہر طرف جنگل ہی جنگل۔ میری بیوی نے میرے ساتھ چلنے کے لیے اصرار بھی کیا تھا لیکن میں نے خود ہی انکار کردیا کیونکہ مجھے خود بھی گاؤں سے نفرت تھی لیکن جب یہاں آیا تو معاملہ ہی الٹا ہوگیا کہ اب اس گاؤں سے جانے کو دل بالکل ہی نہیں کہتا تھا۔ دو چار مہینوں میں بچوں اور والدین سے ملاقات کے لیے چلا جاتا ہوں اور جلد ہی واپس چلا آجاتا ہوں۔ بیوی بھی مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتی ہے کہ کہیں میرے شوہر کسی دوسری بیوی کے چکر میں نہ پڑ گئے ہوں لیکن یہاں تو کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی۔ اپنا دل تو پانی کی طرح صاف و شفاف تھا۔ ہر ہفتہ ہم سب کا پروگرام تالاب سے مچھلی پکڑنے کا ہوتا اور مچھلی پکانے کی ذمہ داری ہم اکثر سر کے حوالے کردیتے اور وہ بھی اس کام کو انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیتے کہ بس کہہ نہیں سکتے۔ ہمیں یہاں آئے چار ماہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ یہاں کے لوگ ہمارا کافی احترام کرتے ہیں۔ تقریباً 200 بچے ہمارے پاس زیر تعلیم تھے۔ نہایت شریف اور بھولے بھالے بچے تھے۔ اس روز بھی ہم ہفتہ کے بازار میں خریداری کررہے تھے اور سر نہ جانے کہاں گھوم رہے تھے۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو ایک کھولے والے سے بات کرتے نظر آئے۔ انھوں نے اپنی پوری تنخواہ مٹی کے کھلونوں پر خرچ کردی۔ میں حیرت زدہ تھا کہ ان کے نہ تو بیوی نہ بچے اتنے سارے کھلونے کیا کریں گے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں پوچھ ہی بیٹھا کہ سر! یہ کھلونے کس کے لیے خریدے ہیں۔ وہ مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔ میرے عزیز! مجھے بچوں سے والہانہ لگاؤ ہے۔ جب میں ان کے مرجھائے ہوئے چہروں کو پڑھتا ہوں، دل میں ایک کسک اٹھتی ہے اور جب میں ان کی مدد کرتا ہوں تو خود کو بے حد مطمئن خوش پاتا ہوں۔ آخر یہی بچے تو ہمارے پیارے ہندوستان کے معمار ہوں گے۔ اگر یہ ابھی سے غریبی کی چکی تلے دب جائیں گے تو ہمارے ہندوستان کا کیا ہوگا۔ میں تو ہر بچہ کو خوش و خرم دیکھنا

چاہتا ہوں۔ میں سر کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا کہ سر کتنے عظیم انسان ہیں اور میں انھیں مزید عزت دینے لگا۔

اس طرح دن گزرتے رہے۔ بچے کافی سمجھ دار ہوگئے۔ لوگ اپنے گاؤں کا نقشہ دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھتے تھے۔ سر کا یہ معمول تھا کہ روزانہ کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور خرید لیتے۔ ایک روز تو انھوں نے ہفتے کے بازار سے کافی کپڑے خرید لیے جس میں خوب صورت ساڑھیاں، شال، نیکر، بنیان اور نہ جانے کیا کیا تھا اور گاؤں میں لا کر یتیموں و مسکینوں میں تقسیم کر دیے۔ اگر میں بھی ایسا کرتا تو ضرور میری بیگم مجھ پر شک کرنے لگتیں۔ کل ہی ہماری تنخواہ ملی تھی اور اتفاق سے دوسرے ہی روز ہفتہ کا بازار بھی تھا۔ بازار گاؤں سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر لگتا تھا۔ ہمارے اسکول کا پورا گروپ بازار پہنچا۔ خریداری کرتے کرتے رات ہوگئی۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ ہم اپنا سامان کاندھے پر اٹھائے چلے آرہے تھے کہ بازار میں ایک آٹھ دس سال کی عمر کا لڑکا روتا بلکتا ہوا نظر آیا جو کوئی سامان بیچ رہا تھا اور ہاتھ پھیلائے بھیک بھی مانگ رہا تھا۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ چوٹی اور ربن بیچ رہا تھا۔ اچانک سر کی نظر اس پر پڑی۔ اس کے قریب پہنچے اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے اس لڑکے تک پہنچے۔ انھوں نے بچے سے رونے کا سبب پوچھا تو وہ روہانسی آواز میں بولا۔

”آج میں دن بھر گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتا رہا کہ میرے چوٹیلے بک جائیں گے تو میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے کچھ کھانے کا سامان لے جاؤں گا۔ ایک پیسہ بھی نہیں کمایا۔ اب میں کیا منہ لے کے گھر جاؤں۔ وہ سب میری راہ تکتے ہوں گے۔ اور میں آج بھی کچھ لے کر نہ گیا تو وہ کل کی طرح آج بھی بلک بلک کر روتے ہوئے سو جائیں گے۔ اس لیے صاحب میں بھیک مانگ رہا تھا کیونکہ مجھ سے ان کی بھوک نہیں دیکھی جاتی۔ کیا آپ میرے چوٹیلے خریدیں گے؟

سر نے اس کی پریشانیاں سن کر اسے اپنے سینے سے لگالیا اور اس واقعہ سے ان کی بھی آنکھیں چھلک پڑیں اور اسے دلاسا دیتے ہوئے بولے ”نہیں بیٹا..... کتنی بھی مجبوری کیوں نہ ہو لیکن بھیک کبھی نہیں مانگنی چاہیے۔ یہ بہت بری بات ہے۔ وعدہ کرو کبھی بھیک نہیں مانگو گے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمھارے بہن بھائی بھیک سے پیٹ بھریں؟ آدمی کو اپنی محنت کی کمائی سے پیٹ بھرنا چاہیے۔ اچھے بچے بھیک نہیں مانگتے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں صاحب! میں اب کبھی بھیک نہیں مانگوں گا۔ اب آپ ہی بتائیے میں کیسے خالی ہاتھ گھر جاؤں؟“ وہ لڑکا جو بے حد ذہین معلوم ہوتا تھا سر سے دریافت کرنے لگا۔

سر مسکراتے ہوئے بولے: ”اچھا بتاؤ تمھارے یہ سارے چوٹیلے اور ربن کتنے کے ہیں۔“

وہ سب کا اندازہ کرتے ہوئے عجلت سے بولا: ”یہ تو ویسے سو روپے کے ہیں۔ آپ اسی روپے دے دیجیے۔“ بچے نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ واقعی سب چوٹیلے خرید لیں گے۔ سر نے اپنی جیب سے سو روپے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور اس لڑکے کے سارے چوٹیلے اور ربن اپنے تھیلے میں کر لیے۔ لڑکا روپے پا کر خوشی سے کھل اٹھا جیسے اس کے ہاتھوں قارون کا خزانہ لگ گیا ہو۔ سر پھر اس سے مخاطب

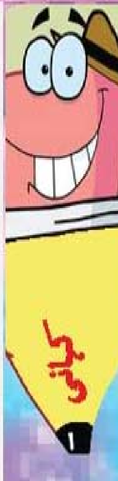

ہوکر بولے "جاؤ بیٹے اب گھر جاؤ اور آئندہ کبھی بھیک مت مانگنا۔" لڑکا توبہ کر کے روانہ ہوگیا۔ ہم سب سر کے چہرے کو تکتے جا رہے تھے اوہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولے۔

"دیکھو قیوم ابھی یہ بچہ ہے۔ اگر اسے روکا نہیں گیا تو کل کو یہ غلط راستہ اختیار کرسکتا ہے کیونکہ گیلی لکڑی مڑ سکتی ہے، سوکھنے کے بعد اگر اسے موڑا جائے گا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ میں ان کی باتوں سے لاجواب ہوگیا اور ہم باتیں کرتے ہوئے گاؤں آگئے۔ دوسرے روز سارے چوٹیلے اور ربن گاؤں کی یتیم اور غریب لڑکیوں میں تقسیم کردیے۔ گاؤں کے لوگ انھیں فرشتہ سمجھتے تھے۔

ایک روز اچانک ان کے تبادلے کی اطلاع آگئی۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ وہ اس رات اتنا روئے کہ ان کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ وہ اس گاؤں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی روانگی کے روز گاؤں کا ہر فرد، بچہ، بوڑھا، نوجوان شان محمد صاحب کو الوداع کہہ رہا تھا۔ میرا بھی دل ان کی جدائی پر تڑپ اٹھا۔ اب اس گاؤں میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ چھٹی لے کر پھر شہر چلا جاؤں کیونکہ گاؤں میں وحی سر ہی تو تھے جو میرے بے حد عزیز تھے۔ جو میرے سرپرست تھے اور ہر وقت ان کا شفقت بھرا ہاتھ میرے شانوں پر ہوتا تھا۔ گاؤں والوں نے آخر سر کو تگ ودو کر کے پھر گاؤں میں بلوالیا۔ ان دو مہینوں میں سر نہایت لاغر ہوگئے تھے۔ سبھی گاؤں والے ان کی آمد پر خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ ساتھ ہی ان کی مدد سے میری خوشی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ میں آج بھی ان کا بے حد قدردان ہوں کیونکہ وہ انسان کے بھیس میں فرشتہ ہیں۔

وہ بلاشبہ عظیم انسان ہیں۔ بے حد عظیم۔

■

Mohd Qayyum Meo

قلمکاروں سے گذارش

'بچوں کی دنیا' بہت مقبول رسالہ ہے۔ اس میں عام فہم معلوماتی مضامین، کہانیاں اور نظمیں شائع کی جاتی ہیں۔ بچوں کی ذہنی سطح کا بھی خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ بعض مضامین میں بہت ثقیل اور اَدق الفاظ ہوتے ہیں۔ اس سے گریز کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

مضمون نگاروں سے گذارش ہے کہ 'بچوں کی دنیا' کے لیے جو تخلیقات ارسال کریں وہ کسی اور رسالہ/اخبار کو نہ بھیجیں اور مضمون کے ساتھ اپنا مکمل پتہ مع پن کوڈ، موبائل نمبر اور اپنی تازہ ترین تصویر ضرور ارسال کریں اور اپنا مختصر تعارف (بایوڈاٹا) بھی بھیجنے کی زحمت فرمائیں۔

سعدیہ پروین

خوب کھلائی کھیر

ایک بستی میں ایک دولت مند تاجر رہتا تھا۔ اس نے اپنی تجارت سے خوب دولت کمائی لیکن وہ جتنا دولت مند تھا، اس سے کہیں زیادہ کنجوس اور دوسروں پر تو دور خود اپنے اوپر ہی مشکل سے خرچ کرتا تھا۔ اپنے دوستوں کو تو کبھی پانی تک کو نہیں پوچھتا تھا۔

شاکر تاجر سیٹھ کا بے حد پیارا اور منہ لگا نوکر تھا۔ سیٹھ کی کنجوسی کی عادت کو وہ اچھی طرح جانتا تھا اس کو اپنے مالک کی اس عادت کا بڑا افسوس بھی تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا مالک کنجوس ہونے کے باوجود دل کا صاف اور نیک ہے۔

ایک دن تاجر کے کچھ دوست اس سے ملنے آئے۔ اتفاق سے تاجر گھر پر نہیں تھا۔ شاکر نے اپنے مالک کے دوستوں کو عزت سے بٹھایا اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس پر تاجر کا ایک دوست بول پڑا۔ ارے بھائی شاکر! تم تو پانی وغیرہ کو پوچھ لیتے ہو، پر تمھارا مالک...... بھائی کمال کا آدمی ہے وہ۔

تاجر سیٹھ کا دوسرا دوست بولا: تم ہم سب کو اپنے مالک کی طرف سے اچھی سی دعوت کرادو۔

مالک اور دعوت؟ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ وہ کچھ سوچتا ہوا بولا، اچھا بتایئے آپ لوگ کیا کھانا چاہتے ہیں؟

بھئی تم نے ٹیڑھی کھیر کی والی بات کہی ہے نا تو پھر ایسا کرو کھیر کی دعوت کرادو تب تمھاری چالاکی کو جانیں۔ ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے آپ لوگ تیسرے دن جمعرات کو آیئے۔ آپ لوگوں کو بڑھیا کھیر کھانے کو ملے گی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

شاکر کے اس طرح کہنے پر سب حیرت میں پڑ گئے تھے۔

سیٹھ سے اور کھیر کی دعوت؟ بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ تیسرے دن آنے کی بات کہہ کر سب وہاں سے چلے گئے۔ شاکر سوچ میں ڈوب گیا، اچانک اس کے چہرے پر مسکان آگئی۔

تاجر سیٹھ کے گھر آنے پر وہ بڑبڑانے لگا۔ پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں، کھیر نہیں جیسے کوئی بہت بڑی قیمتی چیز ہو، میرے مالک کی حیثیت کو للکار رہے تھے، نہیں جانتے کہ ایسی کھیریں تو مالک نے نہ جانے کتنوں کو کھلادیں، کھیر کیا کھا آئے جیسے کوئی بہت بڑا تیر مار لیا، جو مالک کا مذاق بنا رہے تھے۔

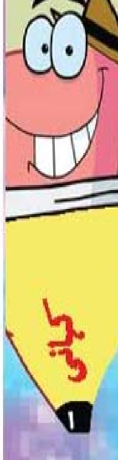

بھئی کیا ہوگیا ہے۔ یہ کھیر کا کیا معاملہ ہے شاکر! جو غصے میں بڑابڑا رہے ہو؟ تاجر سیٹھ نے اس سے پوچھا۔

تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر شاکر بولا: ابھی کچھ دیر پہلے آپ کے کچھ دوست یہاں آئے تھے۔ کہیں سے کھیر کھا کر آئے تھے۔ بڑی اونچی اونچی ہانک رہے تھے اور تو اور آپ کی عزت اور حیثیت کا مذاق اڑانے لگے کہ کیا کھائے گا تمھارا مالک ایسی کھیر، آخر کار میں نے کہہ ہی دیا کہ ہمارے مالک نے جو کھیر کھائی ہے وہ تو آپ لوگوں نے دیکھی بھی نہ ہوگی اور آپ جیسوں کو نہ جانے کتنی کھلادیں۔

اس بات پر آپ کا ایک دوست مذاق اڑاتا ہوا بولا کہ تمھارے سیٹھ کسی کو کھیر کھلائیں گے ایسا تو خواب میں ہی ہو پائے گا۔ بس مالک مجھ سے نہیں سہی گئی آپ کی بے عزتی۔ میں نے کہہ دیا: ایسی بات ہے تو آپ لوگ جمعرات کو آیئے پھر دیکھیے کہ کیسی کھیر کھلاتے ہیں میرے مالک آپ لوگوں کو، زندگی بھر آپ لوگ یاد رکھیں گے، انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے آپ سب۔

کیا تم نے جمعرات کو کھیر کی دعوت دے دی ہے؟

پاگل تو نہیں ہوگئے ہو تم! اتنا خرچ میں کیسے کرسکتا ہوں نہیں بھائی یہ نہیں ہوسکتا۔

ارے کمال کرتے ہیں مالک! آپ کی عزت بڑی ہے کہ کھیر؟ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی آئے اور آپ کو اس طرح بے عزت کرکے چلا جائے۔ یہ تو میرے لیے ڈوب مرنے والی بات ہوگی مالک۔ آپ کا نمک کھایا ہے میں نے، شاکر نے زور دیتے ہوئے کہا۔

ہاں ہاں وہ سب تو ٹھیک ہے پر یہ تو سوچو کھیر بنانے میں کتنا خرچ ہوگا، سیٹھ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

اب مالک آپ ہی فیصلہ کرلیں کہ کیا کرنا ہے؟

کھیر بڑی ہے کہ آپ کا مان اور عزت؟ جو زیادہ قیمتی لگے اسے بچالیجیے، شاکر نے سر جھکا کر کہا۔

عجیب پریشانی میں گھر گیا تھا سیٹھ، کھیر وہ بھی کھانا چاہتا تھا مگر عزت وشان کی بات پر خرچ کی بات سوچ کر وہ گھبرا گیا۔ آخر کچھ سوچ کر بولا، ٹھیک ہے بناؤ کھیر لیکن سب چیزیں کم سے کم خرچ ہوں۔

شاکر مسکراتے ہوئے من ہی من میں بولا، واہ مالک راضی ہوئے بھی تو کنجوسی نہ چھوٹی۔

پروگرام کے مطابق تاجر سیٹھ کے سبھی دوست اس کے گھر پہنچ گئے۔ سیٹھ نے سبھی کو عزت اور پیار سے بٹھایا۔ بات چیت کا سلسلہ چل پڑا حالانکہ وہ سیٹھ سے بات چیت کررہے تھے لیکن ان کا ذہن شاکر کی طرف تھا کہ وہ وعدے کے مطابق کھیر لاتا ہے یا نہیں۔ کھیر کی امید انھیں بہت کم تھی۔ تبھی شاکر ایک بڑی سی تھالی میں کھیر سے بھرے ہوئے کٹورے لیے حاضر ہوا۔

اس کو کھیر کے ساتھ دیکھ کر وہ سب حیرت میں پڑ گئے۔ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہورہا تھا۔ شاکر کے چہرے پر فتح کی مسکان تیر رہی تھی۔ وہ سب اچانک بول پڑے۔

بھئی شاکر تم نے تو کمال کردیا۔ تاجر سیٹھ حیران ہوکر کبھی شاکر کو تو کبھی اپنے دوستوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے دوست کھیر کھانے میں لگے تھے۔ ■

Dr. Sadia Parveen
Chhattar Pura Mau Nath Bhanjan
Dist: Mau - 275101 (UP)

امان الحق بالاپوری

سائنس گھر ہے جانا

کوئی نیا بہانہ ہم سے نہیں بتانا
اس بار ہم کو چاچا میلے میں لے کے جانا

ابو مرے ہیں افسر جاتے ہیں روز دفتر
گھر پر گزارتے ہیں چھٹی کے دن وہ اکثر
عادت نہیں ہے ان کی کہیں گھومنا گھمانا
اس بار ہم کو چاچا میلے میں لے کے جانا

تنہا مرا ہے آنا سامان بوریت کا
یاروں کا ساتھ ہونا حامل ہے اہمیت کا
پیغام یہ خوشی کا ان کو بھی ہے سنانا
اس بار ہم کو چاچا میلے میں لے کے جانا

بندر خریدنا ہے مجھ کو نہ کوئی ہاتھی
گڑیا بھی میرے دل کو بالکل نہیں لبھاتی
مجھ کو نیا نویلا روبوٹ اک دلانا
اس بار ہم کو چاچا میلے میں لے کے جانا

میلے کی سیر کا ہم لیں گے مزہ کچھ ایسا
بہروپیوں کا دیکھیں ہوتا ہے روپ کیسا
آکاش کے وہ جھولے ہم کو بہت جھلانا
اس بار ہم کو چاچا میلے میں لے کے جانا

کٹھ پتلیاں رہیں نہ بائیسکوپ والے
اب ہیں کہاں مداری بندر نچانے والے
پیچھے وہ رہ گئے ہیں آگے بڑھا زمانہ
اس بار ہم کو بچو سائنس گھر ہے جانا

■

Amanul Haque
Jawil Bes, Old City, Balapur
Distt: Akola - 444302 (Maharashtra)

عاتکہ ماہین

بارش آئی بارش آئی

صبح سویرے بارش آئی
سب بچوں نے خوشی منائی
سونو نے یوں شور مچایا
آج اسکول نہیں جانا ہے
آج ہمیں تو گھر رہنا ہے
خوب شرارت بھی کرنا ہے
سب نے اپنی چھتری کھولی
لال، ہری اور نیلی چھتری
چھتری لے کر باہر نکلے
اتنے میں ہی بادل گرجے
خوب زور سے بجلی کڑکی
سونو ڈر کے اندر بھاگا
اس کے پیچھے مونو بھاگا
دونوں نے ہی دھوم مچائی
بارش آئی بارش آئی

■

Atika Maheen
Research Scholar, DePt of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

فلکیاتی نظارے

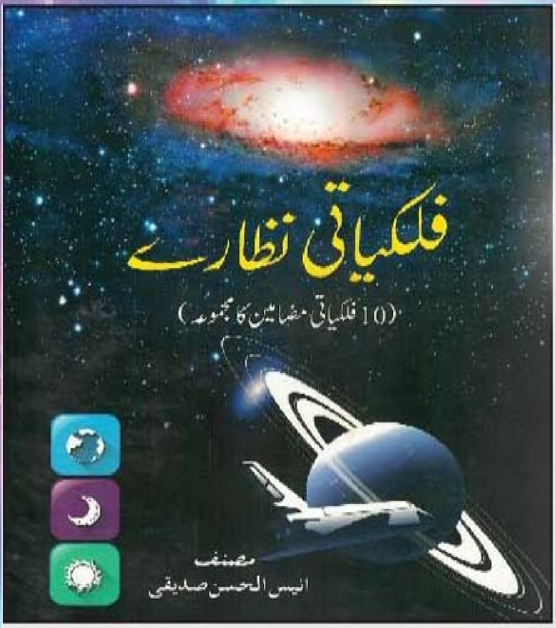

پیارے بچو! قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر بہت عمدہ کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ دور سائنس کا ہے اور آج کے معاشرے کو سائنس کی بڑی ضرورت بھی ہے اسی لیے اس ادارے نے بچوں کی ذہنی سطح کا خیال رکھتے ہوئے سائنس کے متعلق بھی مختلف کتابیں شائع کی ہیں۔ 'فلکیاتی نظارے' بھی سائنس ہی کی کتاب ہے جس میں خلا اور اسپیس کے حوالے سے زیادہ گفتگو کی گئی ہے۔ مصنوعی سیارچوں کی وجہ سے ٹیلی فون، موبائل، انٹرنیٹ، وائی فائی، جی پی ایس، ویڈیو کانفرنسنگ وغیرہ میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہورہی ہی اسی لیے اس کے بارے میں جاننا بچوں کے لیے بہت ضروری ہے۔

کتاب کے مصنف انیس الحسن صدیقی ہیں جو بچوں کے لیے سائنسی مضامین لکھتے رہے ہیں اور ان کی تحریریں بچوں کے رسائل اور دیگر اخبارات وغیرہ میں چھپتی رہی ہیں۔ فلکیاتی نظارے میں کئی مضامین ہیں۔ پہلا مضمون 'عجیب وغریب نیلے بادل' کے عنوان سے ہے جس میں آسمان میں موجود نیلے رنگ کے بادل کا احوال بیان کیا ہے۔ یہ مضمون پڑھنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نیلے بادل کی حقیقت کیا ہے اور کس طرح اس پر نئے نئے انکشافات کیے گئے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ "یہ بادل رات کے اندھیرے میں خوب چمکتے ہیں اور نظارہ کرنے والوں کا دل لبھاتے ہیں کیونکہ ان کی خوبصورتی کا جواب نہیں ہے۔ یہ بہت ہی دلکش ہوتے ہیں۔ یہ خلا کے کنارے منڈلاتے رہے ہیں۔ یہ دبلے پتلے، چھوٹے برقی نیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔"

'ہماری دنیا کے لیے ایک آزمائشی دن' میں دمدار سیارے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ "یہ دمدار سیارہ ہر سال ظاہر ہوتا ہے اور جب ظاہر ہوتا ہے تو لوگ اس سے ڈر جاتے ہیں لیکن سائنس دانوں کے خیال میں یہ ہمارے شمسی نظام کے عمارتی معمار ہیں۔" مصنف ہمیں بتاتے ہیں کہ "دمدار سیارہ ایک چھوٹی سی خلائی چیز ہے جو مختلف قسم کی برف اور چٹانی

ڈھیلوں اور دھول سے بنی گیند جیسی ہوتی ہے۔ یہ سیارے سورج سے سیکڑوں کھرب کلومیٹر دور پائے جاتے ہیں۔ یہ سیارے ہماری دنیا کی فضا سے رگڑ کھا کر نہ صرف جلتے ہیں بلکہ جل کر خاک بھی ہو جاتے ہیں۔'' 'چاند کی جانب ہندوستان کے بڑھتے قدم' میں ہندوستانی خلائی تحقیقی ادارہ 'اسرو' کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور چندریان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چندریان کے حوالے سے بہت اچھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ 'رہائشی سیارہ کی دریافت' میں مصنف نے ایک ایسے سیارے کے انکشاف کی کہانی بیان کی ہے جہاں پانی کی موجودگی کا پتا چلا ہے اور اس کی وجہ سے وہاں رہائش بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ اس کی دریافت کا سہرا سوئزر لینڈ، فرانس اور پرتگال کے سائنس دانوں کی ٹیم کے سر جاتا ہے، اس ٹیم نے اس سیارے کا درجۂ حرارت ناپنے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے اور اس کے نتیجے میں اس نے بتایا ہے کہ اس سیارے پر پانی اپنی اصل حالت میں باقی رہ سکتا ہے۔ 'مریخ پر پانی کی تلاش' میں سیارہ مریخ کی حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ کیا مریخ پر پانی کی موجودگی کا امکان ہے؟ مصنف کہتے ہیں کہ ''مریخ کی ہیئت اور وہاں کی فضا پانی کو اس کی اصلی حالت میں باقی رکھنے میں معاون نہیں ہے۔ چنانچہ وہاں پانی کا پایا جانا بھی مشکل ہے۔''

'کائنات کا نقطۂ آغاز' میں میں بہت اہم جانکاری دی گئی ہے۔ اس میں مصنف نے بگ بینگ کی جزئیات پر روشنی ڈالی ہے۔ 'ہندوستان کے مشن چندریان اول' میں اس کی کامیابی کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور مرحلہ وار اس مشن کے تمام اہم امور کی نشان دہی کی گئی ہے۔ 'سورج کے سات رنگ' میں مختلف احوال میں بدلنے والے سورج کے رنگوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ہر رنگ کے نظر آنے کی خاص حالتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ 'کہکشائیں کیا ہیں؟ میں کہکشاں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ ''کہکشائیں گھومتے ہوئے ستاروں، گیس اور دھول کا مجموعہ ہے۔ جہاں کہیں بھی ہم خلا میں مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم کو لاتعداد ایسے آسمانی شہر دکھائی دیتے ہیں جو کہ مختلف سائزوں میں ہیں اور جس میں چند ستاروں سے لے کر اربوں سے بھی زیادہ ستاروں اور دسوں، سیکڑوں اور ہزاروں نوری سالوں کے آر پار علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔'' آخری مضمون 'پیر غائب' (دہلی کی ایک انمول قدیمی فلکیاتی مشاہدہ گاہ) میں ایک مخصوص عمارت کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو کسی زمانے میں فلکیاتی مشاہدہ گاہ تھی۔ اس عمارت کو پیر غائب بھی کہا جاتا تھا کیونکہ کوئی پیر صاحب اس عمارت میں چلہ کشی کرتے ہوئے غائب ہو گئے تھے۔ کتاب میں اس عمارت کے مختلف حصوں کی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ کس حصے سے فلکیاتی مشاہدے کا کام لیا جاتا تھا۔

'فلکیاتی نظارے' میں خوبصورت تصاویر بھی ہیں جو فلکیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بہت مفید ہیں۔

پیارے بچو! اگر آپ کے اندر سائنسی ذوق ہے تو یہ کتاب ضرور پڑھیں۔ اس طرح کی کتابیں پڑھنے سے آپ کے ذہن کے دریچے کھلیں گے اور آپ کو نئی نئی معلومات ملیں گی جو مستقبل میں آپ کے لیے مفید ثابت ہوں گی!

'فلکیاتی نظارے' 73 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت 60 روپے ہے۔

تیرہویں قسط

اردو زبان کا جادو

پیارے دوستو! 'بچوں کی دنیا' آپ سب کا اپنا رسالہ ہے۔ ہماری کوشش رہتی ہے کہ رسالے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور کارآمد تحریریں شائع کی جائیں۔ اِس رسالے کی اشاعت کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زبان 'اردو' کو فروغ دیں اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس زبان کو سیکھیں۔ کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لیے اگر اس میں کھیل اور مزے کو شامل کرلیا جائے تو سیکھنے میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ ہم نے اردو زبان کے لسانی کھیلوں پر مشتمل ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو قومی اردو کونسل سے شائع کتاب 'اردو زبان کا جادو' سے لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ سب اس سلسلے کو پسند کریں گے۔ (ادارہ)

اِس ذہنی آزمائش کے جوابات اِسی شمارے میں آپ کو مل جائیں گے۔

(13) بھیڑوں کا ریوڑ

مقصد : الفاظ میں ایک ہی گروپ کے حروف کی پہچان

ہدایت : نیچے دائرے میں 'د' اور 'ز' گروپ کے حروف والے الفاظ دیے گئے ہیں۔ مثال کے مطابق دائرے میں سے متعلقہ حروف کے الفاظ تلاش کرکے کالموں میں لکھیے۔

کھلاڑی: 1 وقت: 6 منٹ نمبر: 6

مرضی لڈو ژال
کپڑا بھدا دادا عزت گڑبڑ
ذکر بد جرم ڈال لذیذ جڑ
لذت برا سڈول میز بھاری
ژرف کڑوا شریر گڈمڈ ژالہ
عزیز شہد عذاب دم گڑیا
کرم مزاج دام ذرہ جھنڈ خدا

مثال

د	ڈ	ذ	ر	ڑ	ز	ژ
بھدا بد دم دام خدا						

بچوں کی دنیا

ساتویں قسط

اَدِتیہ

سمندری لڑکا

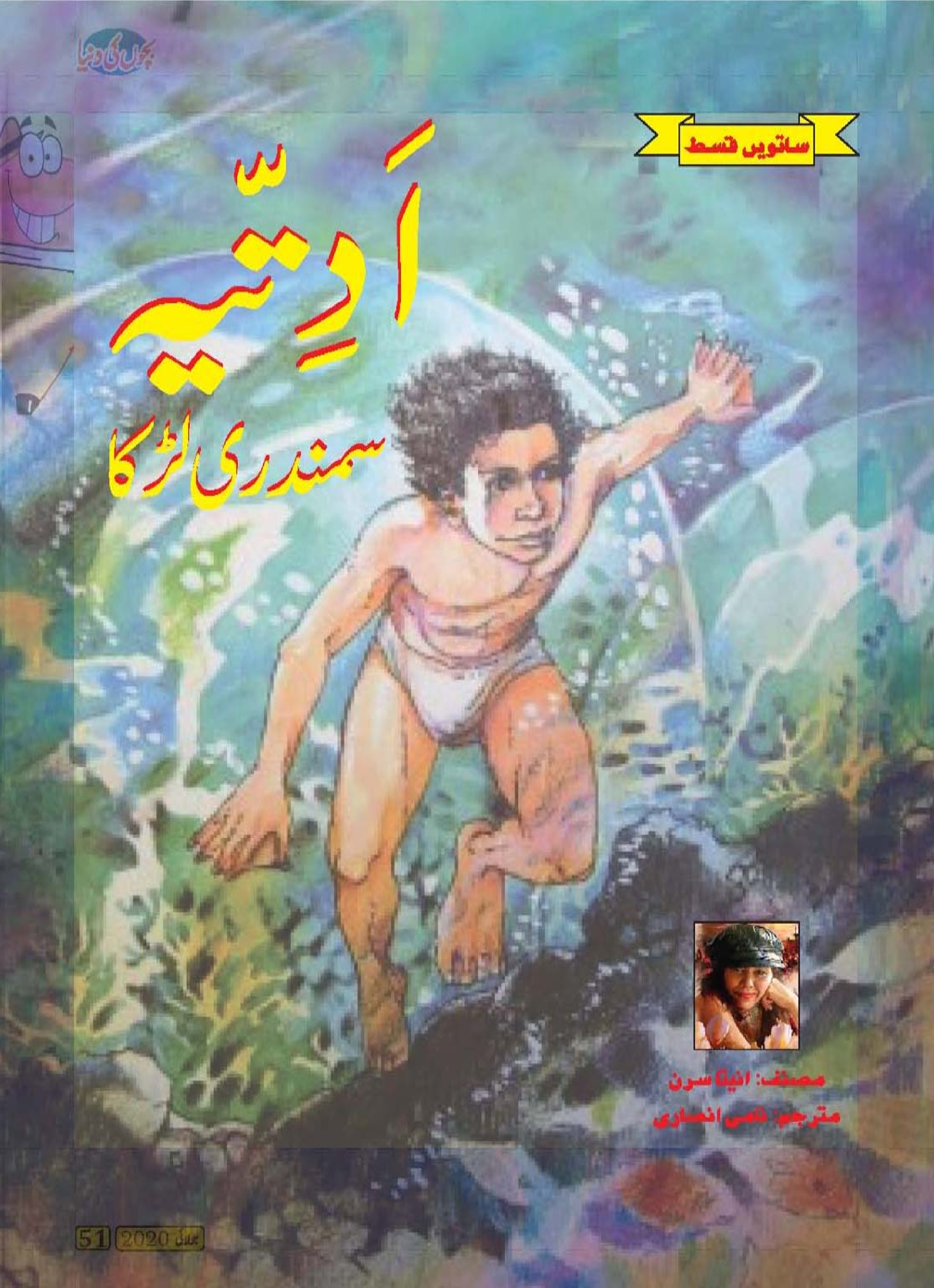

مصنف: انیتا سرن
مترجم: نامی انصاری

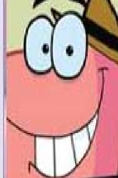

پروفیسر سین سمندر اور سمندری مخلوقات پر ریسرچ کررہے ہیں۔ انہوں نے اپنے جین سے ایک سمندری انسان تیار کیا تھا جو آدھا انسان اور آدھا ڈولفن ہے۔ جو انسانوں کی طرح بات کرتا ہے۔ ڈولفن کی باتیں سن سکتا ہے۔ انہیں جواب دے سکتا ہے، اس انوکھی مخلوق کا نام ادتیہ ہے۔ پروفیسر سین نے سمندر کی گہرائی میں دفن راز اور ڈولفن سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اسے بنایا ہے۔پندرہ ڈولفن مچھلیوں نے طویل سفر شروع کیا تو ادتیہ ان مچھلیو ں کی 'لیڈر کی' کی پیٹھ پر بیٹھ کر سمندری سفر پر روانہ ہوگیا۔ سبھی لوگ آسٹریلیا پہنچ گئے۔ وہاں انہیں ڈاکوؤں کا ایک جہاز سمندر کی تہہ میں نظر آیا۔ جہاز کے کیپٹن کی لاش کے ہاتھ میں ایک لاکٹ تھا جس کے اندرایک کاغذ نکلتا ہے ۔اس میں اس شخص کا اپنی بیوی کے لیے پیغام ہوتا ہے۔ ادتیہ اُسے وہیں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈولفن مچھلیاں ادتیہ کے گرد جمع ہوجاتی ہیں۔ کی نامی ڈولفن مچھلی ادتیہ کو سمندر کے بارے میں بہت سی باتیں بتاتی ہے جس سے سمندر، زمین اور ان سے متعلق بہت سے اسرار سامنے آتے ہیں۔ایک دن اس کی نظر نارنجی رنگ کی طشتری پرپڑتی ہے اور وہ اس کی حقیقت جاننے کی کھوج میں لگ جاتا ہے۔پھر پرنس اٹلان، ادتیہ، بادل دوست، کی اور شہزادی اٹلیا کی ملاقات ہوتی ہے۔ پودے نما کیڑے مکوڑوں، ڈولفن سے دوچار نیز پرمودا کے تکون مندر کے بارے میں پتہ چلتاہے۔ پچھلی قسط میں آپ نے پڑھا کہ ڈولفن نے کس طرح ایک بچہ کی تفریح کا سامان فراہم کیا۔اور کس طرح ادتیہ نے تیسری آنکھ کے ذریعے قربانی کے مندر کے حیرت انگیز واقعات دیکھے۔ادتیہ نے غیر فطری انسان کا بھی مشاہدہ کیا۔اور لال رنگ کے گل بوٹے والی مینا بھی دیکھی۔اب آگے

ایک جوگی

مونگے کے کھوہ کی طرف جاتے ہوئے ادتیہ نے اونا کو اپنے ایڈونچروں کی بہت سی باتیں بتائیں جن کو سن کر اکثر اونا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''میں کی کی بہت سراہنا کرتا ہوں۔'' اونا نے کہا۔ ''یہی تو میں بھی کرتا ہوں۔'' ''دیکھو وہاں ایک کھوہ ہے۔ادتیہ نے اس سفید رنگ کے کھوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو پہاڑوں کے ایک سلسلے کے بیچ میں واقع تھا۔ ''میں اس کے اندر پریوں کی کہانی والی شہزادی کی طرح رہ سکتی ہوں۔'' ''کیا تمھیں پریوں کی کہانیاں بہت پسند ہیں؟'' ادتیہ نے پوچھا ''بہت زیادہ! لیکن میرے ماں باپ چاہتے ہیں کہ میں سنجیدہ کتابیں پڑھوں۔ وہ کہتے ہیں کہ پریوں کی کہانیوں میں جھوٹی سچی باتیں ہوتی ہیں جن کا بچوں کے اوپر غلط اثر پڑتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمارے آس پاس اصلیت کا مسالہ اتنا زیادہ ہے کہ ہم اس سے تھک جاتے ہیں۔ کبھی ہم اڑنے کی بات سوچتے ہیں اور اپنے بازوؤں کا ٹیسٹ کرنے لگتے ہیں۔ کی تو جاگتے ہوئے بہت سے خواب دیکھ لیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ سورج اسے ایک دیوتا کی طرح لگتا ہے جب کہ

لوگ اسے جلتی ہوئی گیس کا گھر بتاتے ہیں۔ پھر چاند کا معاملہ ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ وہاں جا چکے ہیں اور اس کو انھوں نے خشک چٹانوں سے بھرا ہوا پایا ہے لیکن دنیا میں رہتے ہوئے ہم اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت پریوں والی کہانیوں کی بھی ہے۔"

"تمھاری عمر کیا ہے ادتیہ! باتوں سے تو تم بہت گہری سوچ والے انسان لگتے ہو!" "پندرہ سال" "اور یہی عمر میری بھی ہے۔" اودنا نے خوش ہو کر جواب دیا۔

"کسی نے مجھے سکھایا ہے کہ کس طرح ہر چیز کے بارے میں گہرائی سے سوچنا چاہیے۔ جو میں کہتا ہوں، ممکن ہے کہ میری عمر والوں کو وہ عقل کی بات لگے لیکن اصل میں یہ صرف کامن سنس ہے۔" "یہ رہا تمھارا قلعہ شہزادی! یہ پانی کے اندر بہت سندر جگہ ہے۔"

دونوں ایک پتھر پر پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ چکے تھے۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک آدمی لنگوٹی پہنے ہوئے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کا جسم کسرتی اور مضبوط اور جلد کالی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال اس کے کاندھوں پر پڑے ہوئے تھے اور اس کے چہرے پر بڑی نرمی اور پاکیزگی تھی۔ اس کی آنکھیں بچوں کی آنکھوں کی طرح زندگی سے بھرپور تھیں۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر ایک باریک مسکراہٹ تھی۔

"شاید آپ کوئی جوگی ہیں!" ادتیہ نے تعجب سے پوچھا

"ہاں میں جوگی ہی ہوں۔ اب شاید تم یہ جاننا چاہو گے کہ میں یہاں بیچ سمندر میں کیا کر رہا ہوں۔" "مگر یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں کیا پوچھنے جا رہا ہوں۔" ادتیہ نے کہا۔

"میں دماغ کی بات پڑھ لیتا ہوں بچہ! تمھارے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں یہاں سمندر اور اس کے عجائبات کی

اسٹڈی کررہا ہوں۔"

"کیا آپ پانی کے اندر رہتے ہیں؟" اونا نے پوچھا "ہاں! کسی حد تک! لیکن میں زیادہ وقت اس کھوہ کے اندر گیان دھیان میں گزارتا ہوں۔" جوگی نے کہا۔ "لیکن تم نے سنا ہوگا بچہ! کہ جوگی اپنے دماغ اور جسم پر پورا کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں۔ جو چیز تم سائنس کے ذریعے حاصل کرتے وہ ہم اپنی کوششوں سے حاصل کر لیتے ہیں۔" ہاں میں نے یہ تو سنا ہے کہ جوگی ننگے پاؤں دہکتے ہوئے انگاروں پر چل لیتے ہیں لیکن یہ نہیں سنا کہ وہ پانی کے اندر بھی رہتے ہیں۔" ادتیہ نے جواب دیا۔

"آؤ بچہ! یہاں میرے پاس بیٹھو! یہ صرف چیزوں پر دماغ کی برتری ہے۔ ہم اپنے پھیپھڑوں کو کم سے کم سانس لینے کی تربیت دیتے ہیں۔ ہم تم سے بہت زیادہ ہلکی سانس لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم اپنی اندریوں پر اندرونی طاقت سے کنٹرول کر لیتے ہیں۔" یہ تو بہت مشکل ہے!::: اونا نے کہا "نہیں اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ کچھ جانور بھی یہ کام کر لیتے ہیں۔ ہاتھی، بندر سے زیادہ ہلکی سانس لیتا ہے۔ اس لیے اس کی عمر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کچھ سانپ، کتوں سے زیادہ ہلکی سانس لیتے ہیں۔ وہ بھی زیادہ دنوں تک جیتے ہیں۔ ہمالیہ کے پہاڑوں پر چمگادڑیں سردی میں کئی ہفتوں تک بغیر ایک مرتبہ سانس لیے ہوئے سوتی رہتی ہیں۔ ہمالیائی ریچھ لمبے عرصے تک بے ہوشی کی نیند سوتے رہتے ہیں۔ بظاہر وہ مردہ معلوم ہوتے ہیں۔ ساہی اپنے بھٹ میں مدتوں بغیر سانس لیے ہوئے پڑی رہتی ہے۔ پھر آدمی ایسا کیوں نہیں کرسکتا؟"

"میں نے تو یہ کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔" ادتیہ نے کہا "کیا آپ جاڑے میں سردی نہیں محسوس کرتے" اونا نے پوچھا "سردی! میں ہمالیہ کی چوٹیوں پر ایک بہت ہلکا کپڑا پہنے ہوئے مدتوں تک رہا ہوں، اور آپ کیا کر سکتے ہیں؟" ادتیہ نے جوگی سے پوچھا۔ "میں وقت کے آگے اور پیچھے سفر کرسکتا ہوں" واقعی! کیا آپ کے پاس ٹائم مشین ہے؟ "سمندر میں ایک ٹائم گیٹ ہے۔ یہ ایک زبردست بھنور کی طرح ہوتا ہے۔ کیا تم وقت میں سفر کرنے سے دل چسپی رکھتے ہو؟"

"یقیناً میں پتھر کے زمانے میں جانا چاہتا ہوں تاکہ میں دیکھ سکوں کہ ہمارے پرکھوں نے کس طرح آگ کی دریافت کی تھی۔" ادتیہ نے جواب دیا۔

ٹائم گیٹ

ادتیہ جوگی کے ساتھ سمندر کے اندر سفر کرتے ہوئے بہت خوش تھا۔ اس نے یہ سفر آلتی پالتی مار کر کیا تھا۔ مچھلیاں اور مونگے ان سے دور ہی رہتے تھے۔ "میں یہ کیسے سمجھوں گا کہ میں پتھر کے زمانے ہی کا سفر کررہا ہوں، کسی اور زمانے کا نہیں!" "تم اس بات پر پورا دھیان لگاؤ کہ تم کہاں جارہے ہو۔ جب تم واپس لوٹنا چاہو تو اپنی کھوہ کو اپنے دماغ کی آنکھوں میں بسالو۔ مگر ایک بات ہے، اگر پتھر کے زمانے کے آدمیوں نے تم کو دیکھ لیا تو وہ بھاگ کر چھپ جائیں گے کیونکہ تم ان سے بالکل الگ ہو۔ وہ تم کو جان سے بھی مار سکتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم ان کو نظر ہی نہ آؤ۔ اس کے علاوہ اس طریقے سے تم ان کی بہتر اسٹڈی کرسکو گے۔ میرے جادوئی تعویذ سے تم ان کے دماغ کی بات بھی پڑھ لوگے۔"

"بے شک! نہ دکھائی پڑنے کی صورت میں، میں زیادہ

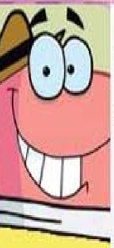

قسط وار ناول 1

حفاظت سے رہوں گا۔'' ادتیہ نے تلوار جیسے بڑے دانتوں والے ان شیروں اور ریچھوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے کہا جو ہاتھی سے بھی چھ گنا زیادہ جسامت کے ہوتے تھے۔ اس وقت جوگی نے اپنی کمر سے بندھے ہوئے ایک لاکٹ کو نکال کر ادتیہ کی گردن میں پہنا دیا ''جب تم ٹائم گیٹ پر پہنچ جاؤ تو اس لاکٹ کو رگڑ دینا۔ پھر تم کو کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔''

ادتیہ کے پیٹ میں تتلیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ جب اس نے ٹائم گیٹ کا بھنور دیکھا تو وہ اتنی تیزی سے گردش کر رہا تھا کہ کوئی بھی چیز اگر ہوتی تو اس کے اندر سما جاتی۔ اس کے کنارے کا پانی سفید جھاگ سا بن گیا تھا۔ ''یہ تو بالکل ایک بلیک ہول معلوم ہوتا ہے'' ادتیہ نے کہا ''فکر مت کرو۔ میں اس کے اندر رہ چکا ہوں۔ تم بھی زندہ رہو گے۔ تم اس کے اندر صرف ایک منٹ ہی رہو گے۔ اچھا! اب اپنی آنکھیں بند کرو اور 'پتھر کے زمانے' کی طرف پورا دھیان لگاؤ۔ سوچنے کی کوشش کرو کہ وہاں کی زمین، آدمی اور جانور کیسے ہوں گے۔'' ادتیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے ایک جنگل دیکھا جس میں انوکھے قسم کے درخت تھے اور وہاں کے مرد اور عورت چھال لپیٹے ہوئے، جڑی بوٹیاں کھوج رہے تھے۔ اس نے جانوروں کے تلوار جیسے دانت بھی دیکھے۔ ''میں تیار ہوں'' ادتیہ نے کہا۔ اچھا رخصت! اونا کے بارے میں پریشان مت ہونا۔ میں اس کی حفاظت کروں گا۔''

اپنی ساری ہمت اکٹھی کر کے ادتیہ نے خود کو ٹائم گیٹ کے پرشور بھنور کے سپرد کر دیا۔ اس نے اپنی سانس کو ہلکا کر لیا، جیسا کہ جوگی نے اس سے کہا تھا۔ بھنور نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ بھنور کی طرح گھومنے لگا۔ لیکن یہ عمل فوراً ہی رک گیا۔ اب ادتیہ ایک کھوہ کے سامنے کھڑا تھا۔ فوراً اس نے اس لاکٹ کو چھو کر رگڑ دیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے پیر نیچے سے غائب ہو گئے ہیں۔ اسے ہنسی آ گئی۔

جنگل بہت گھنا تھا۔ چھوٹی بڑی شاخوں نے زمین کو گھیر لیا تھا۔ کھوہ کے اوپر دو درختوں کے بیچ میں ایک بیڈ لٹکا ہوا تھا جو چھال کا بنا تھا۔ ایک آدمی آ کر اس بیڈ پر لیٹ گیا۔ ادتیہ نے اس کو سوچتے ہوئے پایا۔ ''گوشت بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔ جب ہمیں بھوک لگتی ہے تو ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اس کا مزہ کتنا خراب ہے۔ ہم اس میں کچھ جڑی بوٹیوں کو ملا کر اس کا مزہ ٹھیک کر لیتے ہیں۔ پھر جانوروں کو کھوہ سے دور رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ کتنا خوفناک تھا جب بھیڑیا ایک زندہ بچے کو اٹھا لے گیا تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا پڑے گا۔ اب مجھے شکار کے لیے جانا چاہیے۔ بچے بھوکے ہیں اور وہ خراب گوشت نہیں کھائیں گے۔'' وہ گہری سانس لے کر اٹھ بیٹھا اور اپنی کمر میں بندھے پتھر کے دھاردار چاقو کو چھو کر دیکھا ''شاید اس بار ہرن مل جائے۔ اس کا گوشت زیادہ اچھا ہوتا ہے۔''

وہ جنگل کے اندر گیا۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا اور اس سے پہلے ہی مجھے گوشت حاصل کر لینا چاہیے۔ اس نے سوچا۔ ادتیہ نے آہستہ آہستہ پاؤں رکھتے ہوئے اس کا پیچھا کیا لیکن کوئی پتہ اس کے پاؤں کے نیچے آ کر ٹوٹ گیا جس سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور وہ آدمی چونک کر پیچھے دیکھنے لگا اور اپنے بھاری نتھنوں سے سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''کیا کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے؟ ممکن ہے یہ میرا خوف ہو۔'' ادتیہ کو تھوڑا سا اطمینان ہوا۔ پتھر کے زمانے کے لوگوں کی سونگھنے کی طاقت ہم سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس کو کوئی نہیں

دیکھ سکتا۔اس نے لاکٹ کو پھر سے چھولیا۔اس آدمی نے اب ایک ہرنی کو دیکھا۔ادتیہ نے سوچا کہ اب وہ اس کا شکار کرے گا۔ ہرنی ساکت کھڑی تھی مگر اس کی کالی ناک اور بھورے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ ''تم مجھے اس طرح مت دیکھو! میں تمھارا شکار نہیں کروں گا'' آدمی نے اپنے دل میں کہا ''ادتیہ نے سوچا کہ آج کی دنیا میں ایسے کتنے شکار ہوں گے جو اس طرح سامنے کھڑے ہوئے ایک جانور کو چھوڑ دیں گے۔اسی وقت جنگل میں کسی بڑے جانور کے گرجنے کی آواز گونجی۔گرد کا ایک زبردست جھونکا ان کی طرف آرہا تھا۔''یہ کیا چیز ہو سکتی ہے! یہ تلوار کے دانتوں والا جانور تو یقیناً نہیں۔'' ادتیہ نے سوچا اور ایک بہت گھنی جھاڑی کے پیچھے ہولیا۔وہ آدمی خاموشی سے ایک بڑے درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔''وہ کیا کر رہا ہے۔ اس طرح تو وہ آسانی سے کسی جانور کا شکار ہو جائے گا۔ یہ ایک خوفناک سینگوں اور بے رحم آنکھوں والا ایک جنگلی سور تھا۔اس نے جیسے ہی آدمی پر چھلانگ لگائی وہ ایک طرف جھک کر اس کو جھکائی دے گیا۔سور نے درخت پر حملہ کر دیا۔اس کے تیز دانت درخت کے تنے میں گھس گئے۔ ٹھیک اسی وقت وہ آدمی اس پر پل پڑا اور اپنا چاقو اس کے جسم میں داخل کر دیا۔

سور تلملا کر رہ گیا۔ادتیہ وہاں سے ہٹ گیا۔کیونکہ مرتے ہوئے سور کی کراہ بڑی بھیانک تھی۔''شاید طوفان آنے والا ہے۔اندھیرا ہونے سے پہلے ہی مجھے اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے۔'' سور کے شکار کو اپنی پیٹھ پر لادتے ہوئے اس نے سوچا۔ادتیہ عورتوں اور بچوں کی کلکاریاں بن سکتا تھا۔نم ہوا میں گہری سانس لیتے ہوئے وہ آدمی اپنے جھولے والے بیڈ کے پاس کھڑا تھا۔ کئی بچے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے اور چیختے چلاتے ہوئے

آگیے۔ "وہ کیسا شکار لایا ہے۔ کیا اس کا گوشت مزے دار ہوگا!" پندرہ چھوٹے بڑے بچوں کی آواز ادتیہ کے دماغ میں آئی۔ پھر ایک عورت آکر بچوں کے پاس کھڑی ہوگئی۔ پھر سب مل کر شکار کو اپنے پتھر کے گھر کے اندر لے گئے۔

کسی وجہ سے اس آدمی کو زیادہ بھوک نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ایک انبار تھا۔ ستاروں کا خیال! وہ آسمان کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ ستارے یہاں سے کتنے زیادہ دور ہیں۔ ان کا ایک گروپ ریچھ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ آسمان میں اتنے بہت سے بادل ہیں۔ طوفان بہت بھیانک ہوتا ہے۔ شاید ستارے، چاند کے پیچھے ہوتے ہوں گے اور بادل چاند ستاروں کے سامنے رہتا ہوگا۔ یہ سب ستارے بعض وقت چھپ تو جاتے ہیں مگر آسمان سے نیچے کیوں نہیں گر جاتے! شاید رات بھی ایک بہت بڑے کالے جانور کی کھال ہے جو آسمان سے لپٹ جاتی ہے۔ اس میں بڑے بڑے سوراخ ہوتے ہیں جن سے ہم تاروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ آخر طوفان آ ہی گیا۔ بارش کی بڑی بڑی بوندیں ادتیہ کے اوپر گرنے لگیں۔ اس نے ایک چٹان کے نیچے پناہ لے لی۔ اس کو عورتوں اور بچوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ کیونکہ تیز ہوا بڑی بڑی شاخوں کو ہلائے دے رہی تھی جس سے خوفناک آواز پیدا ہوتی تھی۔ پھر زور زور سے بجلی کڑکنے لگی۔ ادتیہ نے زمین کی خوشبو کو اپنے نتھنوں میں محسوس کیا۔

آدمی اپنی جگہ لیٹا رہا۔ وہ بجلی کی تڑپ کو دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ اس کا منہ بارش سے بالکل بھیگ چکا تھا۔ یہ زبردست کڑک شاید دیوتا کا غصہ ہے۔ اسی وقت ایک پیڑ پر بجلی گری جس سے زبردست چمک پیدا ہوئی۔ آدمی دوڑتا ہوا اس درخت کے پاس پہنچ گیا جو جل رہا تھا اور جس کی روشنی آس پاس پھیل گئی تھی۔ عورتیں اور بچے کھوہ کے دروازے پر کھڑے اس روشنی کو دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ آدمی بڑی ہوشیاری سے اس جلتے ہوئے درخت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اس کو پکڑنے جا رہا ہوں۔ ہوشیاری سے اُڑی! یہ کوئی خوفناک جانور ہے جو پیڑ کو کھائے جا رہا ہے۔" ایک عورت نے آدمی سے کہا "شاید وہ بھوکا ہے" ایک بچہ منمنایا۔ "مرنا نہیں" اُڑی نے کہا اور ایک جلتی ہوئی شاخ کو اپنے کھوہ میں لے جانے لگا۔ "اس کے لیے کچھ اور کھانے کو لاؤ۔" اڑی نے عورت سے کہا "اگر یہ روشنی زندہ رہی تو اس سے ہمارے کھوہ میں اجالا رہے گا اور ممکن ہے کہ جنگلی جانور بھی اس کو دیکھ کر بھاگ جائیں۔"

جنگلی سور کا بچا ہوا آدھا گوشت اس آگ کے قریب رکھا ہونے کی وجہ سے دھواں دینے لگا تھا اور اس میں کچھ اچھی خوشبو نکلنے لگی تھی۔ ازی نے گوشت کو آگ کے اور نزدیک کر دیا اور جب اس میں سے ایک ٹکڑا نکال کر اپنے منہ میں رکھا تو اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ "ستارے بھی شاید شعلے ہی ہیں۔ ہم لوگ اب اس آگ کو بجھنے نہیں دیں گے۔" (اس طرح پتھر کے زمانے میں آگ کی ایجاد ہوئی)

جاری.....

■

ماخذ: اُدتیہ-سمندری لڑکا، مصنف: انیتا سرن
مصور: سُہیر رائے، مترجم: نامی انصاری، ناشران:
(1) چلڈرن بک ٹرسٹ
(2) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی (3) بچوں کا ادبی ٹرسٹ

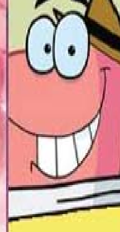

دل کی باتیں

* دوست سب ہوتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی دوست ہوتے ہیں جو جان سے بھی زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔
* جو دکھ دے اسے چھوڑ دو مگر جسے چھوڑ دو اسے دکھ نہ دو۔
* کامیابی کا نشہ کبھی دماغ پر چڑھنے مت دیجیے اور ناکامی کا معاملہ کبھی دل پر مت لیجیے۔
* زندگی جینے کے دو ہی راستے ہوتے ہیں بھول جاؤ انھیں جن کو معاف نہیں کر سکتے، معاف کر دو انھیں جن کو بھلا نہیں سکتے۔
* ہزاروں غلطیوں کے باوجود آپ اپنے آپ سے پیار کرتے ہیں تو پھر کسی کی ایک غلطی کی وجہ سے اس سے نفرت کیوں کرنے لگتے ہیں۔
* اچھے کے ساتھ اچھے رہو لیکن برے کے لیے برے مت بنو کیونکہ تم پانی سے خون صاف کر سکتے ہو مگر خون سے پانی نہیں۔
* پانی بنو جو اپنا راستہ خود بناتا ہے، پتھر نہ بنو جو دوسروں کا راستہ روک لیتا ہے۔
* اچھے وقت سے زیادہ اچھا دوست عزیز رکھو کیونکہ اچھے دوست برے وقت کو بھی اچھا بنا دیتے ہیں۔
* ماں باپ ہمیں شہزادوں کی طرح پالتے ہیں اس لیے ہمارا فرض ہے کہ بڑھاپے میں ہم بھی انھیں بادشاہوں کی طرح رکھیں۔
* جھوٹ کا بھی ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ خود بولو تو میٹھا لگتا ہے اور کوئی دوسرا بولے تو کڑوا لگتا ہے۔
* سچا دوست وہ ہے جو آپ کی طرف اس وقت آئے جب ساری دنیا آپ کا ساتھ چھوڑ چکی ہو۔
* بھروسہ ایسا تحفہ ہے جو دولت دیکھ کر نہیں بلکہ قابلیت دیکھ کر دیا جاتا ہے۔
* کسی کو دھوکہ مت دو کیونکہ دھوکہ جس سے شروع ہوتا ہے اسی پر ختم ہوتا ہے۔
* خوبصورت ہونا اہم نہیں ہے بلکہ اہم ہونا خوبصورت ہے۔
* زندگی کی کتاب میں اتنی غلطیاں مت کرو کہ پنسل سے پہلے ربر ختم ہو جائے اور توبہ سے پہلے زندگی۔
* حالات انسان کو نہیں انسان حالات کو سنوارتے ہیں۔
* جو بہت اچھا لگے اس سے بہت کم ملا کرو۔
* جو انتہا سے زیادہ اچھا لگے اسے صرف دیکھا کرو۔
* اور جو دل میں سما جائے اسے صرف یاد کیا کرو کیونکہ جو جس کے جتنا قریب ہوتا ہے دنیا اسے اتنا ہی دور کر دیتی ہے۔
* دوستی کرنا ہے تو ہم سے کرو جو زندگی میں ہی نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی کندھوں پر اٹھاتے ہیں۔
* سچا دوست وہ ہوتا ہے جو ہمیں کبھی بھی نہیں گرنے دیتا نہ ہی کسی کی نظروں میں نہ ہی کسی کے قدموں میں۔

■

مرسلہ: الفیہ شیخ انیس عظمیٰ سکندر خان، درجہ نہم، نور اردو ہائی اسکول، دھولیہ، مہاراشٹر

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہو گئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھ لیں کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

ادیبہ عفت

خدمت

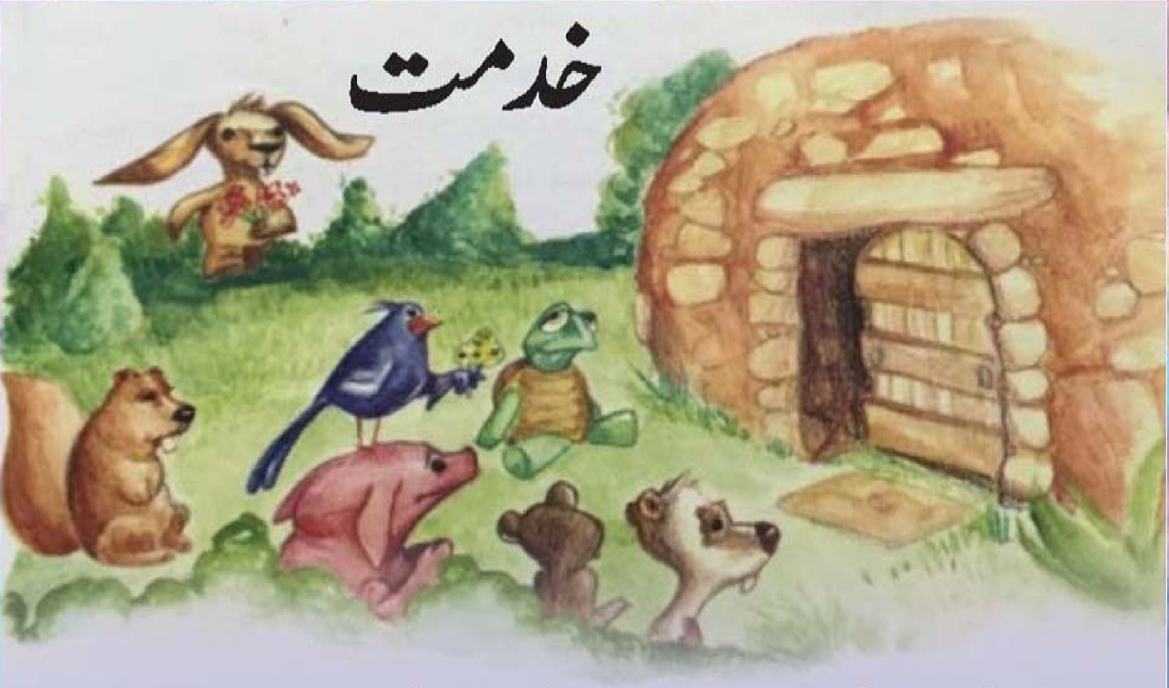

سنو بچو! اک بات پرانی
ہے ایک جنگل کی کہانی
اس میں ایک گھمنڈی شیر رہتا تھا
خود کو جنگل کا بادشاہ سمجھتا تھا
جب وہ چلا جاتا تھا اپنی گپھا کے اندر
موج مناتے، چوہا، بلی، لومڑی، بندر
ایک دن شیر بہت بیمار ہوا
اور تنہائی کا شکار ہوا
شیر کے باہر نہ آنے پر باقی جانور سوچنے لگے
سب لوگ گپھا کی جانب دیکھنے لگے

چوہا بولا
میں جاؤں گپھا کے اندر
چوہا گیا گپھا کے اندر

شیر سے باہر نہ نکلنے کا سنا ماجرا
چوہے نے باہر آ کر اپنے دوستوں کو سنایا شیر کا ماجرا
تینوں نے شیر کی خوب خدمت
ان کی خدمت سے شیر ہوا شرمسار
شیر بھی بن گیا اب ان کا دوست
جنگل میں سب کا راج ہوا
چاروں طرف سکون و امن ہوا
یہ کہانی ہمیں یہ سبق سکھاتی ہے
اچھائی کبھی نہ کبھی رنگ لاتی ہے

■

Adeeba Iffat
Class: XII
M S Inter College
Sikandarabad

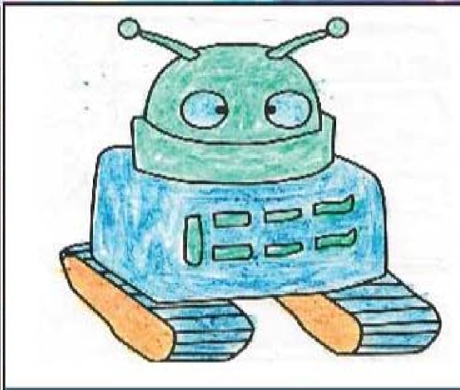

محمد رشید بن مولانا ابوالحسن ارشد، مدرسہ عیدگاہ، کاندھلہ

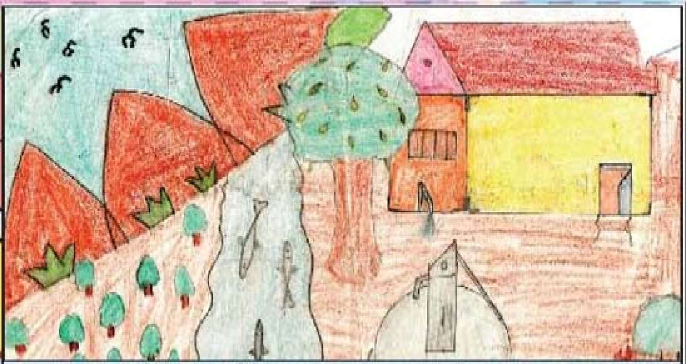

یاسمین الطاف بپالری، درجہ ہفتم
سرکاری اردو ہائر پرائمری مدرسہ نمبر 2 ہیل ہونگل، کرناٹک

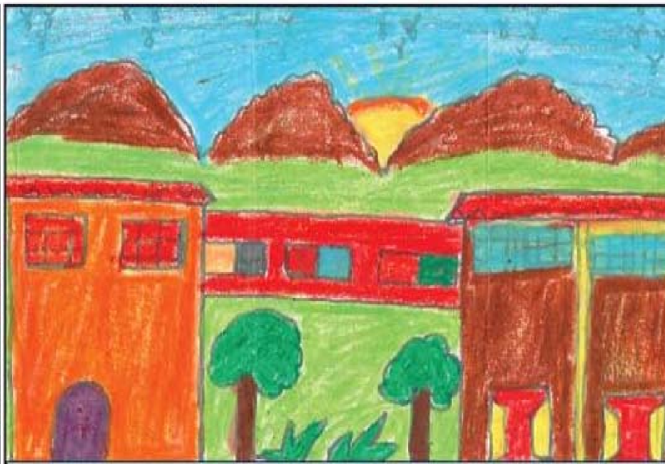

زینب سلیم خان، درجہ ششم، انٹاپ ہل، وڈالا، ممبئی

محمد ایان آصف خان، درجہ چہارم (B)
سنگم نگر، انٹاپ ہل، وڈالا، ممبئی، مہاراشٹر

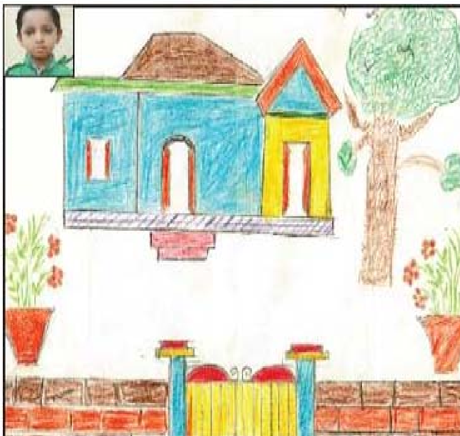

اثیم احمد جمیل احمد، درجہ چہارم
ضلع پریشد اردو ڈیجیٹل اسکول کرہ دیٹنگی، امراؤتی، مہاراشٹر

مستقیم خان آصف خان، الحسنات اردو ہائی اسکول، رسلپور، تعلقہ راویر، مہاراشٹر

عفت بنت ڈاکٹر اصغر احمد، درجہ پنجم، الہدیٰ اردو پرائمری اسکول، بیڑ (مہاراشٹر)

حمزہ، درجہ سوم، ڈیڈ پبلک اسکول، نئی دہلی

انصاری محمد عبداللہ، مدینہ پارک، دھولیہ، مہاراشٹر

عدنان شیخ عظیم، الہدیٰ اردو پرائمری اسکول بھوکردن، مہاراشٹر

مصباح منیر احمد چوگلے، درجہ دوم
اردو اسکول، گورداد، ضلع کولھاپور، مہاراشٹر

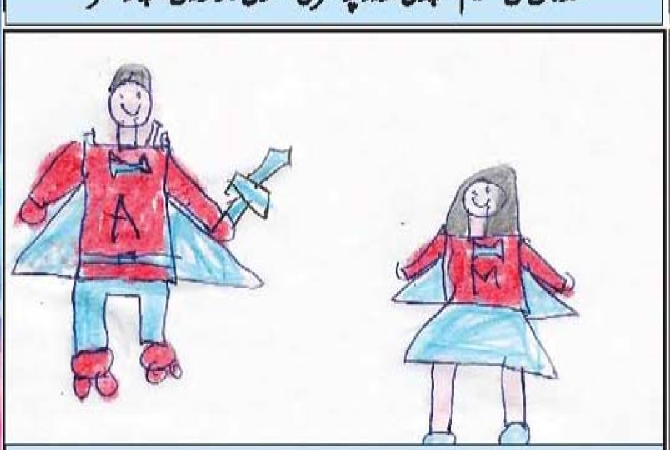

اعیان ذہیب، درجہ اوّل، الحرا انٹرنیشنل اسکول، شاہین باغ، نئی دہلی۔ 25

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

صحت الفاظ

مصنف: سید بدرالحسن

ساتویں طباعت: 2019

صفحات: 253

قیمت: 90 روپے

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

کہکشاں (اقبال کے بعد نظمیہ شاعری)

مصنف: وارث علوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 527

قیمت: 240 روپے

لفظ (کچھ نظمیں اور غزلیں)

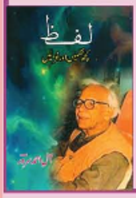

مصنف: آل احمد سرور

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 95

قیمت: 70 روپے

مثنوی مولانا روم (جلد اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم)

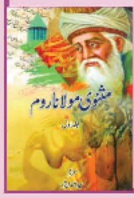

مترجم: سید احمد ایثار

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 223 (جلد اول)، 191 (دوم)، 251 (سوم)، 200 (چہارم) 238 (پنجم)، 256 (ششم)

قیمت: 780 روپے (فی سیٹ)

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 474

قیمت: 215 روپے

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

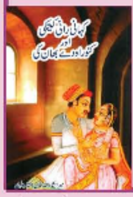

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 30

قیمت: 35 روپے

قطبی علاقے کیا ہیں؟

مصنف: ہایانون

اردو مترجم: انیس الحسن صدیقی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 20

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, July 2020 Vol. 08, Issue: 07
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2019-21
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/06/2020
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

صفحات:112، قیمت:25 روپے

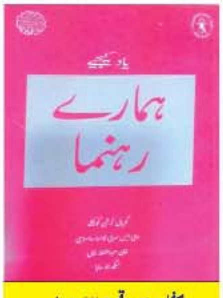

صفحات:166، قیمت:35 روپے

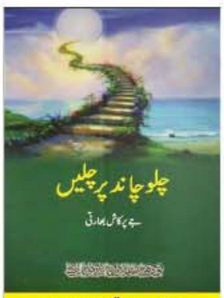

صفحات:48، قیمت:15 روپے

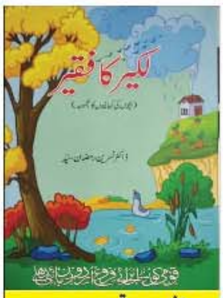

صفحات:82، قیمت:35 روپے

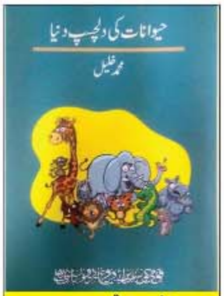

صفحات:83، قیمت:24 روپے

صفحات:61، قیمت:23 روپے

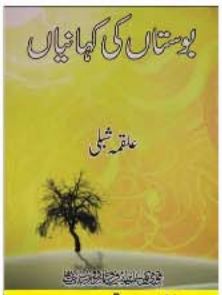

صفحات:87، قیمت:20 روپے

صفحات:61، قیمت:20 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066-

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.